در کفے جام شریعت، در کفے سندانِ عشق کا نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں شعر و سخن کا خاص ملکہ عطا فرمایا ہے، اس کے پردہ میں وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتے ہیں، اس لئے ان کی شاعری ان کے قلبی واردات و باطنی کیفیات کا مرقع، حقیقت و معرفت کے رازہائے سربستہ کی ترجمان، عشق و محبت کے حقائق سے معمور اور جنون و سرمستی کے جذبات سے لبریز ہوتی ہے، دراصل یہ ساز لاہوتی اور ترنم ربانی طالبین و سالکین کے لیے ایک ایسا دستور عمل ہے، جس میں سلوک و عرفان کے ہر گوشہ و مرحلہ کے آثار و نشانات موجود ہیں، اس لئے اس کی شرح و تفسیر کی ضرورت تھی، مگر ذوقی و وجدانی حقائق اور ان کے اسرار و کیفیات کی شرح و تعبیر آسان نہیں، مولانا قمر الزماں صاحب اس کوچہ کے راہرو ہیں، ان کی توجہ و محنت نے "عرفان محبت" کو فیضان محبت کی صورت دیکر جلوہ گاہ عام کر دیا ہے، انھوں نے مولانا کے منتخب عارفانہ کلام کو مختلف عنوانات کے تحت درج کرکے ان کی دلنشیں تشریح کی ہے اور جابجا مزید وضاحت کیلئے دوسرے عارفین خصوصاً "نکتہ دان روم" کے اشعار بھی پیش کیے ہیں جس سے لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت:- مرتبہ جناب اکمل یزدانی جامعی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۴۴، قیمت - دس روپے، پتہ (۱) جنرل پرنٹنگ پریس، لائن بازار، پورنیہ، بہار، (۲) چلچان لائبریری، بہادر گنج، پورنیہ، بہار (۳) محمد فرید بک سیلر کانکی مغربی دیناج پور، بنگال۔

پورنیہ صوبہ بہار کا قدیم ضلع ہے جو پہلے طول و عرض کے لحاظ سے موجودہ ضلع سے کافی بڑا تھا، خلجیوں کے زمانہ میں یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آیا اور مغلوں کے دور میں یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی، سترہویں صدی عیسوی کے آخر سے یہاں کے حکام فوجدار کہلاتے تھے جو برائے نام صوبہ داران بنگال کے ماتحت ہوتے تھے، ان کی حکومت انگریزوں کے دور حکومت سے پہلے تک رہی، اس کتاب میں پورنیہ کے انہی فوجداروں کے دور کا حال بیان کیا گیا ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں فوجداروں کے مختصر حالات، سیاسی خدمات اور فوجی کارنامے بیان کیے گئے ہیں، اور دوسرے باب میں محلات اور مفصلات کے اعتبار سے پورنیہ کی تقسیم کا ذکر کرنے کے بعد اس کی مشہور مسجدوں، مندروں، مقبروں، اہم عمارتوں، سڑکوں اور پلوں وغیرہ کا تذکرہ ہے، پھر مرکزی مقامات اور معروف بازاروں کا ذکر ہے، ایک حصہ میں پورنیہ کی آمدنی، مالگزاری، زندگی، معیار اور اس زمانہ کی مشہور صنعتوں کا ذکر ہے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ طبقوں کے مردوں اور عورتوں کے لباس اور پوشاک کا تذکرہ ہے، اسی باب میں فوجداروں کی علم و ادب نوازی کے ضمن میں پورنیہ میں فارسی اور اردو کے رواج دونوں زبانوں کی کچھ تصنیفات و مخطوطات اور اہم شعرا کا ذکر بھی آگیا ہے، آخر میں فوجداروں کے غیر مسلموں سے اچھے برتاؤ کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، یہ کتاب محنت سے لکھی گئی اور مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۸ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۶ء عدد ۵

مضامین

مقالات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

آہ! مولانا محمد عمران خان ندوی الازہری

۲۲؍اکتوبر ۱۹۸۶ء کو یہ ایک خبر ملی کہ مولانا حافظ محمد عمران خان ندوی ازہری اپنے خاندان والوں کو دل فگار اور اپنے جاننے والوں کو دل گیر چھوڑ کر تہتر سال کی عمر میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے، اس خبر سے جسم و دماغ پر ایک بجلی گر پڑی۔

ان کی موت ایک خاص قسم کی قوت عمل، عزم، ارادہ، خوش انتظامی، خوش سلیقگی، خوش فکری، اور خوش وضعی کی موت ہے، وہ اپنے پیچھے ایک درس چھوڑ گئے کہ عمل پیہم اور یقین محکم سے کس طرح اہم اور بڑے سے بڑا کام انجام دیا جاسکتا ہے، بے سروسامانی میں کیسے کیسے ساز و سامان پیدا کیے جاسکتے ہیں، یاس کے عالم میں مخلص کارکنوں کی جماعت کی تنظیم کیسے کی جاسکتی ہے، اور ناداری کے عالم میں بھی وہ کام انجام دیا جاسکتا ہے جو بڑی دولت کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا۔

وہ بھوپال کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد جب بھوپال کا فرماں روا خاندان بھوپال چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوگیا تھا تو مولانا عمران خان ندوی نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاکر بھوپال کے لوگوں کے دلوں پر اپنی فرماں روائی شروع کردی اور یہ نمونہ پیش کیا کہ تاج و تخت کے بغیر بھی اخلاص کی پاکیزگی، نیت کی طہارت اور عمل کی پختگی کے ساتھ فرماں روائی ہوسکتی ہے۔

انھوں نے تاج المساجد کی تعمیر جس طرح از سرنو کی اور اس کی زینت و آرایش میں جس طرح اضافہ کیا، اور پھر اس کے ذریعہ سے جو دینی حمیت اور ایمانی حرارت پیدا کی، وہ ایسا کارنامہ ہے کہ دنیا کی بڑی مسجدوں کی تعمیر کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا نام نامی بھی اس تاریخ میں ضرور لکھا جائے گا، بڑی مسجدیں تو شاہی خزانوں اور حکومت کی مالی امداد سے بنتی رہیں، لیکن تاج المساجد کی تعمیر مولانا عمران خان ندوی کے کاسۂ گدائی سے انجام پائی، یہ اس کی مثال ہے کہ کاسۂ گدائی کو جام جمشید کس طرح بنایا جاسکتا ہے، تاج المساجد کو

بھوپال کا فرماں روا خاندان اپنے خزانہ سے نہ بنا سکا، لیکن مولانا عمران خان نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر یہ مثال پیش کی کہ عمل پیہم ہو تو آسمان جُن برسا سکتا ہے اور زمین دولت اُگل سکتی ہے، انھوں نے تاج المساجد کے اردگرد اتنی مختلف قسم کی عمارتیں بنوا دی ہیں کہ یہ مسجد کے لیے شاہی خزانہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی، ان عمارتوں کے کرایہ سے جو آمدنی ہوگی وہ شاید تاج المساجد کے اخراجات کے لیے کافی ہو، مرحوم کی مساعی جمیلہ سے اس مسجد کے ساتھ ایک عربی اور دینی مدرسہ بھی دار العلوم تاج المساجد کے نام سے قائم ہے، جس کی شہرت اس وقت تمام ملک میں پھیل چکی ہے، وہ اس کے امیر جامعہ تھے، انھوں نے اپنے شفیق استاذ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یاد میں ایک بزم سلیمانی کی بھی تاسیس کی ہے جو شاید آگے چل کر ایک اہم علمی ادارہ ہوجائے، ان ہی کی سرپرستی میں پندرہ روزہ جریدہ نشان منزل شایع ہوتا رہا جو دار العلوم تاج المساجد کا ترجمان ہے،

دار المصنفین سے ان کا تعلق تقریباً چھپن ۵۶ سال تک رہا، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز شاگرد تھے اپنی شاگردی کا حق انھوں نے حضرت سید صاحبؒ پر ایک سمینار منعقد کرکے اور مطالعۂ سلیمانی کی دلآویز جلد شایع کرکے ادا کیا، وہ مولانا مسعود علی ندوی کے بڑے معتمد علیہ تھے، ان کے خاندان والوں سے آخر وقت تک بڑی وضعداری اور محبت سے ملتے رہے، ملازمت ندوہ کے مہتمم کی حیثیت سے شروع کی، تاج المساجد کی خاطر بھوپال چلے گئے، لیکن ندوہ کو حرز جاں بنائے رکھا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مل کر ندوہ کے تمام مسائل کو حل کرنے میں برابر کے شریک رہے، دار المصنفین کے ہر چھوٹے بڑے جلسہ میں اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن کی حیثیت سے برابر شرکت کرکے اس کی رہنمائی کرتے رہے۔

وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی فقیری میں امیری، اپنی بے سروسامانی میں میر سامانی اور اپنی تنگدستی میں کشادہ دستی کے لیے مشہور رہے، ان کے جسم پر لباس بہت ہی سادہ رہتا، لیکن اس سادگی میں ان کی عزیمت کی پرکاری نظر آتی، وہ پرانے بزرگوں کی طرح اپنی وضعداری کے لیے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے، وہ اپنے معاصروں اور دوستوں سے اختلاف کرتے تو اس میں بھی انکی مروت اور شرافت اخلاق کے موتی جھلکاتے رہتے

وہ اپنے ماتحتوں کو ڈانٹتے تو ان کی ڈانٹ میں اخلاص ہوتا اور ان کی پھٹکار میں کریم النفسی چھپی رہتی، ان کے گھر میں بڑا خوش ذائقہ کھانا پکتا جس کو وہ بہت ہی خوش سلیقگی سے کھاتے اور کھلاتے، وہ منبر پر وعظ کہتے یا تقریر کرنے بیٹھتے تو اپنی بذلہ سنجیوں کے پھولوں کو سامعین پر نچھاور کرتے رہتے جس میں وہ ایمان کی شمامہ کی نکہت بیزی محسوس کرتے،

ان کی موت سے ان کا خاندان ایک شفیق باپ، دار العلوم ندوہ ایک نامور فرزند، تاج المساجد ایک بے مثال نگہبان، تبلیغی جماعت ایک انتہائی متحرک رہنما، بھوپال ایک جلیل القدر شہری اور ملک ایک معزز شخصیت سے محروم ہوگیا، ان کی اولاد اپنے آنسوؤں کے موتیوں کی لڑیوں کے ساتھ ان کی شفقت و محبت کو یاد کرتی رہے گی، دار العلوم ندوہ دعا گو رہے گا کہ ان کا ثانی پھر پیدا ہو جائے، تاج المساجد کے چپہ چپہ پر چشم بینا ان کا نام منقش دیکھے گی، اس مسجد میں جو سالانہ تبلیغی اجتماع ہوگا تو اس کے تمام حاضرین ان کی خوش انتظامی کو اپنی نمناک آنکھوں سے یاد کر کے ان کے ایصال ثواب کے لیے دعائیں کرتے رہیں گے، ملک کے برادران وطن جو ان سے ملتے رہے وہ بھی ان کو اس حیثیت سے یاد کرتے رہیں گے کہ ان کے ایسا اخلاص ملک کے تمام لوگوں میں پیدا ہو جائے تو ان کی دھرتی سونے کی ہو جائے،

جانے والے جا! رخصت، الوداع! تیری تربت مغفرت الٰہی کی خوشبوؤں سے معطر رہے، تیری ابدی آرام گاہ انوار الٰہی سے منور رہے، سلام، لاکھوں سلام۔

وہ مجددی سلسلہ کے مشہور بزرگ اور کامل طریقت حضرت شاہ محمد یعقوب عرف ننھے میاں قدس سرہٗ العزیز سے بیعت ہو کر ان کے زیر تربیت بھی رہے اور ان کے بہت ہی محبوب اور چہیتے مرید اور مجاز بیعت تھے، ان ہی کی ہدایت پر تاج المساجد کے کھنڈر کی از سر نو تعمیر شروع کی، اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت شاہ سعید میاں کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، اور حضرت سعید میاں ان کی رحلت سے ایسے ہی مغموم اور ملول ہوں گے جیسے اپنے خاندان کے کسی شفیق بزرگ کی وفات سے ہوتے، اسی تعلق کی بنا پر مرحوم کی ابدی خوابگاہ ان کے مرشد کے پہلو میں ہے، حالانکہ ان کی ابدی میند کی اصلی جگہ تاج المساجد کے کسی گوشہ ہی میں ہونی چاہیے تھی، مگر شاید خود ان کو اپنے مرشد کی قربت زیادہ عزیز تھی،

مرحوم کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا، ان کی میت کے پیچھے بھوپال کے ایک لاکھ لوگ سوگوار اور گریہ کناں تھے، وہ بھوپال کے عاشق تھے اور اس عاشق کا جنازہ اسی دھوم سے نکلنا چاہیے تھا۔

وہ عالم بقا کو جا رہے تھے لیکن ان کی میت کی غمناک فضا ان کی طرف سے لوگوں سے یہ کہہ رہی تھی ؎

رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد ❊ من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مقالات

شاخت اور حدیث نبویؐ

از:-
ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، استاذ حدیث ملک سعود یونیورسٹی (ریاض)

ترجمہ از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین

تمہید زمین پر انسان کا وجود، مرد و زن کے باہمی تعلقات کا رہین منت ہے، انسانی آبادی کی وسعت اور کثرت بھی اسی سے ہے، فطری طور سے ایک انسان تنہا زندگی گزار نہیں سکتا ہے، اس روئے زمین پر جب تک زندگی کی رونق رہے گی اس وقت تک فرد، خاندان محدود طبقے اور ان محدود و مختصر طبقوں سے ترتیب پائے ہوئے بڑے بڑے معاشرے قائم رہیں گے، اور یہ سب اس کرۂ ارض کی تعمیر میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے، یہ اس لیے کہ انسان اپنی فطرت اور نشو و نما کے لحاظ سے معاشرتی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی صفت سے آراستہ ہے،

معاشرہ میں انسان کو اپنی مادی حاجتوں اور روحانی خواہشوں کو پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ کوشش کرتا ہے کہ جس قدر ممکن ہو، اپنے لیے خیر اور نفع کو حاصل کرلے، اسی لیے افراد کے درمیان مقابلہ اور تصادم کی صورتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، اور اس راہ میں جب انسان بے قید اور بے پناہ ہوتا ہے تو پھر انتشار کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اسی لیے فطری طور سے ہر معاشرہ کے لیے ایک ایسا نظام ناگزیر ہو جاتا ہے، جس میں رسوم و رواج اور قوانین و ضوابط کی کارفرمائی ہو اور

پھر ان سب عوامل کے تحت زندگی گزاری جائے، قانون کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ معاشرہ کی عمدہ قدروں کی روشنی میں، افراد کی زندگی کو منظم رکھے تاکہ اجتماعی زندگی کا کارواں خوبی اور سلامتی کے ساتھ رواں دواں رہے،

یہیں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جب کسی معاشرہ کی اعلیٰ اخلاقی اور انسانی قدروں میں کوئی تغیر ہوتا ہے یا اس معاشرہ کے اجتماعی نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو پھر اس معاشرہ کے قانونی نظام میں بھی تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہے، ایسی مثالیں ان ممالک کی تاریخ میں صاف مل جاتی ہیں، جو ایک نظام سے دوسرے نظام میں منتقل ہوتے ہیں، مثلاً سرمایہ دار ملک جب سوشلسٹ یا کمیونسٹ حکومتوں میں تبدیل ہوئے تو ان کے معاشرہ کے قانونی نظام میں بڑی تبدیلی آئی،

بعثت نبوی کے وقت عرب کی حالت،

اسی طرح جب ہم چھٹی صدی عیسوی کے جزیرۂ عرب پر نظر ڈالتے ہیں کہ کعبہ، پہلا وہ گھر خدا کا، جسے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا تھا، وہ بتوں کی ایک خاصی بڑی تعداد سے بھرا ہوا تھا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ میں داخل ہوئے تو آپ نے کعبہ میں تقریباً ۳۶۰ بتوں کو دیکھا،

مستشرق میور نے لکھا ہے کہ عربوں کے عقیدہ کی بنیاد خالص بت پرستی پر تھی، اور ان کے اس عقیدہ میں کسی کمزوری کی کوئی علامت نہیں تھی، اسی لیے ان کا یہ مضبوط عقیدہ، مصر و شام کی تمام مسیحی تبلیغی کوششوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا، ان کی تجارت میں سود کا معاملہ عام تھا، اور اجتماعی وحدت صرف قبیلہ کی صورت میں نظر آتی تھی، ان کی کوئی باضابطہ اور منظم حکومت نہیں تھی، اسی لیے حکومت اور ریاست کے پیمانہ پر فریاد رسی اور انصاف طلبی کی کوئی سبیل نہیں تھی، تنازعوں کے حل کی دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو انتقام لیا جائے یا پھر فریقین میں سے کوئی ایک کسی فیصلہ کو تسلیم کرلے۔[1]

۱؎ لائف آف محمد، میور: ص ۸۳-۸۲،

ایسے صنم پرست ماحول میں اور ایسے معاشرہ میں جو کسی عادلانہ نظام یا قانون ساز ادارہ سے واقف نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دین کا داعی بنا کر بھیجا، آپ نے دس برس تک مکہ کے سخت اور دشوار ترین حالات میں اسلام کی تبلیغ کی، یہاں یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ آپ کی بعثت سے قبل مکہ میں بعض عیسائی مبلغ موجود تھے اور ایسے شعراء بھی تھے جو بتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن ان مسیحی مبلغوں یا ان شاعروں کو بت پرستوں کی طرف سے کسی مقابلہ یا تصادم کا سامنا نہیں کرنا پڑا، یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ سخت مرحلے اور دشوار گزار منزلیں آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی ہی راہوں میں کیوں آئے، اس کا واحد جواب یہ ہے کہ مشرکین کو یہ خوب معلوم تھا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے اقرار کے بعد زندگی کا رُخ کس سمت ہوجائے گا، ان کو یہ یقین تھا کہ یہ کلمہ محض ایک بے روح کلمہ نہیں ہے، ان کو یہ بھی احساس تھا کہ یہ ایسا کلمہ ہے جو خدا کے سامنے سپر اندازی بلکہ مکمل سپردگی کا طالب ہے، یہ عقل و جذبہ، جسم اور روح، تجارت اور سیاست، قانون اور عبادت اور معاملہ اور فہم معاملہ، ہر چیز میں انسان سے مکمل سپردگی کا تقاضا کرتا ہے، اور اسی کی جانب قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ:[1]

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ
وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝
(الانعام ۶۳-۱۶۲)

آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ کا ہی ہے، جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے، اور میں سب ماننے والوں میں میں پہلا ہوں

قرآن مجید نے اس حیثیت کو یہ کہہ کر اور زیادہ اہمیت دی کہ قانون اور اس کی بالادستی کا عمل صرف خدا کی ذات اور ہاتھ میں ہے،

۱؎ آیتوں کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیان القرآن سے ماخوذ ہے، (ع۔ص)

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهٖ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ۝

(اعراف: ۵۴)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی خوبیوں کے بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں،

ایک جگہ اور فرمایا کہ:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۝

(نحل: ۱۱۶)

اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے، ان کی نسبت یوں مت کہہ دیا کرو کہ فلانی چیز حلال ہے اور فلانی چیز حرام ہے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دوگے، بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پاویں گے،

چنانچہ جب مدینہ میں مسلمانوں کی جماعت زیادہ طاقتور بن کر سامنے آئی تو پھر قرآن کے عطا کردہ اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر ایک اسلامی حکومت بھی وجود میں آگئی،

اس نوخیز حکومت میں قانون کی عملداری صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تھی، اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی کہ:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(جاثیہ: ۱۸)

پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا، سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلیے،

اس لیے کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے لیے یا کسی دوسرے شخص کے لیے خود قانون سازی کرے، کیونکہ قانون سازی یا تشریع صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ کہتے ہوئے قوت تشریع دی کہ:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف: ۱۵۷)

جو لوگ ایسے رسول امی کا اتباع کرتے ہیں، جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے انکو دور

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے پیغمبر کی اطاعت فرض کی، قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بکثرت ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (نساء: ۵۹)

اے ایمان والو، تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو، اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی، پھر اگر تم کسی امر میں باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کی طرف حوالہ کر لیا کرو اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے،

۲- وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (مائدہ: ۹۲)

اور تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرتے رہو اور احتیاط رکھو، اور اگر اعراض کرو گے تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہونچا دینا تھا،

۳- یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (انفال: ۲۰)

اے ایمان والو! اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا، اور اس کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم سن لیتے ہی ہو،

۴- مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (نساء: ۸۰)

جس شخص نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی،

۵- وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (حشر: ۷)

اور رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لے لیا کرو، اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو،

قرآن وحدیث ہی مصدر شریعت ہیں

اس طرح مسلمانوں کے نزدیک یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ تشریع اور قانون سازی کا اساسی مرجع ومصدر، قرآن مجید اور سنت رسول اللہؐ ہے، اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد مسلمانوں کا جاہلیت کے ہر عقیدہ اور ہر قول وعمل سے تعلق ختم ہو گیا ہے، اور ساری اسلامی دنیا کے لیے کتاب وسنت ہی راہ عمل قرار پاتی ہے، چنانچہ جب تک مسلمان ان دونوں سرچشموں سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فیض حاصل کرتے رہے، اس وقت تک وہ غالب اور طاقتور رہے، صدیوں یہی صورتحال رہی، اور جب ان دونوں بنیادی نقطوں سے ان کا انحراف بڑھا، تو عالم اسلام میں فوجی کمزوری آئی اور سیاسی زوال کے ساتھ اقتصادی فقر بڑھا، یہاں تک کہ عالم اسلام کا اکثر حصہ استعمار کے زیر تسلط آیا، اور مسلمان شکست وریخت کی ذلت وخواری سے دوچار ہوئے،

بعض علاقوں میں مسلمانوں نے سامراجیوں کے اس غلبہ سے رہائی کی کوشش کی، جیسا کہ ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک کی تاریخ سے ظاہر ہے، ان لوگوں نے جہاد کے علم کو بلند کیا، اور جان ومال کی قربانی دے کر اپنی سرخروئی کا سامان کیا،

استشراق کا اصل مقصد

لیکن اس کشمکش کے نتیجہ میں استعمار نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں میں جہاد بالسیف کی روح جب تک اثر فرما رہے گی، اس وقت ان کا تسلط اور غلبہ مکمل نہیں ہوگا، اس نے

اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اسلامی معاشرہ کی امتیازی خوبیوں کو ہی ختم کردیا جائے، ان امتیازی خوبیوں میں اسلام کا تشریعی، تعلیمی اور تربیتی نظام تھا، اسی لیے مغربی استعمار کی اولین کوشش اس بات کی رہی کہ وہ شریعت اسلامیہ کو مہمل اور ناکارہ ثابت کرے، اور اس کے لیے اس کے قدیم مصادر و مآخذ میں شکوک و شبہات پیدا کرے، اور پھر ان کی افادی حیثیت پر طنز و تعریض کا رویہ اختیار کرے، تاکہ مسلمانوں کو ان سے رجوع کرنے کا خیال ہی نہ آئے،

قرآن مجید کے اکثر احکام، کلیات اور عمومیات کی قسم سے ہیں، جن کی تشریح و تفسیر کا حق حامل قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، جیسے نماز، اسلام کا بنیادی رکن ہے، قرآن میں متعدد موقعوں پر اقامت صلوٰۃ کا حکم موجود ہے، لیکن نماز کیسے پڑھی جائے، اس کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں ہے، یہ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے، کہ آپؐ اپنے قول و فعل سے اقامت صلوٰۃ کے طریقوں کو بیان فرمائیں، اس طریقہ کار میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ سنت کی اہمیت ثابت ہو، اور اس طرح تشریع و قانون سازی میں اس کے مرتبہ و مقام کی تعیین ہو سکے،

چنانچہ مغرب کی استعماری قوموں نے سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ سنت و حدیث سے جنگ کی جائے، کیونکہ مسلمانوں کو حدیث سے دور کر دینے کے بعد، اور تشریع کے میدان میں اس کے مرتبہ و مقام میں شکوک پیدا کر دینے کی وجہ سے قرآن کریم سے مقابلہ کرنا زیادہ آسان ہو جائیگا،

منکرین حدیث کا وجود،

استعمار کی اس کوشش کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ ظہور میں آیا جس نے پہلے تو حدیث نبویؐ کے کسی ایک جزو کا انکار کیا، مثلاً وہ جہاد بالسیف کی حدیثوں کا منکر ہوا، اور بعد میں اس طبقہ نے پوری حدیث نبویؐ کا ہی انکار کر دیا،

مدعی نبوت مرزا غلام قادیانی اور چکڑالوی، ہندوستان میں اسی فکر کے نمایندے ہوئے جبکہ مصر میں توفیق صدقی نے بھی یہی دعویٰ کیا،

حدیث نبویؐ پر طنز و تشکیک کے اس عمل میں اس "روشن خیال" اور فکری و روحانی شکست خوردہ اور مغربی تہذیب کے دلدادہ طبقہ کے ساتھ مغرب نے اپنے علما، استشراق کی مدد حاصل کی، ان مغربی مستشرقین کے لیے ہر قسم کی مادی آسائشیں فراہم کی گئیں، تاکہ تلاش و جستجو کی ہر راہ ان کے لیے ہموار اور آسان ہو جائے، ساتھ ہی ان کے گرد تقدس کے ہالے بھی قائم کر دیے گئے، حدیث نبویؐ پر حملہ کرنے والے یہ لوگ استعمار کی فوج کا اقدامی دستہ بن گیے، اس طرح اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر ایک جنگ چھیڑ دی گئی، اندرونی محاذ پر یہ "شکست خوردہ لیکن روشن خیال" مسلمان تھے، اور بیرون میں مستشرقین کا ایک ہراول دستہ تھا،

مستشرقین کے اس ہراول دستہ کی پہلی صف میں دو حضرات ایسے ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ شریعت اسلامیہ کے مطالعہ اور تجزیہ میں صرف ہوا، ایک تو سناک ہور جرونیہ[1] اور دوسرے گولڈزیہر، ان دونوں نے حدیث نبویؐ کے مرتبہ اور مقام اور تشریع کی بنیاد کو چیلنج کیا، تاہم وہ کوئی ایسا مربوط و منطقی اور جامع و مکمل نظریہ پیش کرنے سے قاصر رہے کہ جس کی بنیاد پر وہ حدیث اور اس کی تشریعی اہمیت کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدہ پر ضرب لگا سکیں،

شاخت کا مرتبہ،

البتہ ایک اور مستشرق جنھوں نے اس سلسلہ میں نسبتاً زیادہ وسیع اور جدید نظریہ پیش کیا، وہ پروفیسر شاخت ہیں، جن کے بعض نظریات ہمارے اس مقالہ کا موضوع ہیں، شاخت نے اپنے نظریات کا محور فقہ اسلامی کو قرار دیا اور اس لحاظ سے بلاشبہ پروفیسر شاخت کے مرتبہ تک نہ ان کا کوئی پیشرو پہنچ سکا، اور نہ کسی ہم عصر کو دعوائے ہمسری کا یارا ہوا، شاخت نے اپنے نظریات کی تشریح اور تبلیغ کے لیے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں کئی مقالات اور کتابیں لکھیں، ایک کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا" کے نام سے مدون

[1] نام میں عربی تلفظ کا لحاظ رکھا گیا ہے، (ع-ص)

کی۔ ان کی مشہور ترین کتابوں میں "اصول شریعت محمدی" (اوریجنز آف محمڈن جورس پروڈنس) .... ہے، جس نے مغرب کی علمی دنیا میں غیر معمولی قبولیت اور عزت حاصل کی، اس کے متعلق پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ "اسلامی تہذیب اور تشریع کے مطالعہ کے لیے یہ کتاب کم از کم مغرب میں ایک بنیادی کتاب ہوگی۔"[4] لندن یونیورسٹی میں فقہ اسلامی کے پروفیسر کولسن نے اس کتاب کی تعریف میں یہ کہا کہ "شاخت نے شریعت کے اصولوں سے متعلق ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو اپنے وسیع دائرہ میں کسی غلطی کو قبول نہیں کرتا۔"

پروفیسر شاخت کے ان نظریات نے تقریباً سارے مستشرقین کو متاثر کیا، ان میں پروفیسر اینڈرسن، رابس، فیز جیرالڈ، کولسن، اور بوسورتھ جیسے ممتاز اسکالر بھی شامل ہیں، شاخت کے دائرہ اثر میں فیضی، فضل الرحمٰن اور نیازی جیسے مسلمان بھی آتے ہیں۔

شاخت نے اپنی اس کتاب میں اس کی پرزور کوشش کی ہے کہ وہ شریعت کی بنیادوں کو منہدم کردیں، اور اس طرح فقہ اسلامی کی تاریخ کے خدوخال ہی بدل دیں، اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کے محدثین و فقہاء کے بارے میں انھوں نے بار بار یہ تاثر دیا ہے کہ وہ سب دروغ گو خائن اور تحریف کرنے والے تھے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ لندن اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں کسی طالب علم کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ شاخت کی اس کتاب کا تنقیدی مطالعہ و تجزیہ پیش کرسکے، حالانکہ یہ دونوں یونیورسٹیاں، مطالعہ و تحقیق میں آزادی اور غیر جانب داری کا علم بلند کرتی ہیں،

اس طرح شاخت اور ان کے نظریات کو تنقید سے بالاتر قرار دیا گیا، اگر کسی نے ان کے نظریات سے بحث کی تو اس کی یہ تحقیق لائق اعتنا، نہیں سمجھی گئی، جیسا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے

[4] جرنل آف کمپیریٹیو لیجسلیشن اینڈ انٹرنیشنل لا، ج ۳۳ ص ۱۱۴۔

کے ایک استاذ کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا،[5] جنھوں نے فقہ اسلامی میں حدیث نبویؐ سے متعلق شاخت کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے، مثلاً انھوں نے یہ لکھا تھا کہ پروفیسر شاخت اسلام میں شریعت کے مقام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

"قانون یعنی شریعت، بڑی حد تک دین کے دائرہ سے خارج ہے۔"

اسی بات کو انھوں نے اپنی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا" میں زیادہ وضاحت کے ساتھ دہرایا ہے، ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ:

"اسلام کی پہلی صدی کے بڑے حصہ میں اس فقہ اسلامی کا وجود ہی نہیں جو نبی کریمؐ کے عہد میں موجود تھی، اور جو فقہ اور قانون اس وقت رائج تھی وہ دین کے دائرہ سے باہر کی چیز تھی۔"

شاخت کا ایک بنیادی نظریہ

شاخت کی تقریباً ہر تحریر میں اسی نظریہ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، اور یہی نظریہ ان کے تمام خیالات کا مرکزی اور بنیادی نظریہ ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب فقہ یا قانون یا شریعت کا موجودہ ذخیرہ، دین کے دائرہ سے خارج ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اسی طرح صحابہؓ و تابعینؒ جیسے اوّلین مسلمانوں نے اس سے اعتنا نہیں کیا، تو اس میدان میں زیادہ اہتمام کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کبھی اہمیت دی بھی گئی تو یہ وقتی اور فوری ضرورت کے تحت دی گئی، اب اگر مصادر میں کہیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ تشریع کے میدان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے بعد صحابہؓ و تابعینؒ میں علمائے مجتہدین نے کوششیں کیں تو یہ باتیں جھوٹ اور من گھڑت ہیں، شاخت کے ان خیالات کا یہ تجزیہ محض منطقی استدلال کے تحت نہیں ہے، بلکہ انھوں نے نہایت صراحت

[5] السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، ص ۲۷۔

کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "کسی ایک بھی فقہی حدیث کے متعلق یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ وہ نبی کریمؐ سے صحیح طور پر منسوب ہے"[1]۔ شاخت کے ان مذکورہ خیالات کے نتیجہ میں کئی ایسے مقاصد سامنے آئے جو اسلام کے دشمنوں کو مطلوب تھے، اور جن سے ان کی خواہشوں کی تکمیل ہوتی نظر آتی تھی، مثلاً:

۱۔ مسلمان ملکوں میں شریعت کے نفاذ کا مطالبہ اور اس کی آرزو ایک مہمل بات ہے، اصلاً شریعت کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں، بلکہ یہ دین سے خارج کی چیز ہے،

۲۔ حدیث کا وجود ایک فرضی دعویٰ ہے اس لیے جس فقہ کو قرآن و حدیث سے ماخوذ بتایا جاتا ہے، وہ در اصل فقہ اسلامی نہیں ہے، بلکہ اس کا بڑا حصّہ یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کی شریعتوں سے ماخوذ ہے، اور جو حصّہ ان کے علاوہ ہے وہ مجتہدین کے اپنے اجتہادات پر مشتمل ہے[2]۔

اس طرح بحث و تحقیق کے نام پر یہ سبق دیا گیا کہ مغرب کے بنائے ہوئے قوانین سے مسلمان استفادہ کر سکتے ہیں، اور اس سلسلہ میں ان کو یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ان کے دین کی کسی بھی درجہ میں مخالفت ہوتی ہے، بلکہ وہ چاہیں تو ان قوانین کو فقہ اسلامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ ان کے سلف کا عمل بھی ایسا ہی تھا۔

ایسے خیالات کی تہوں میں جو بنیادی اور کھلی غلطیاں ہوتی ہیں، وہ کسی بھی صاحب نظر سے مخفی نہیں، ایسے تصورات سے محض غیر دانشمندانہ اور غیر منصفانہ نتائج کی ہی امید کی جا سکتی ہے، پروفیسر شاخت کی علمی بلند نظری کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا

---

[1] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا، ص ۲۰۳۔ [2] فارن ایلیمنٹس ان اینشنٹ اسلامک لا، شاخت کے ۳۳ ص ۱۷-۹۔

نام "شریعت محمدی کے اصول" رکھا ہے، حالانکہ ہر مسلمان شریعت کو اسلامی شریعت سمجھتا ہے شریعت محمدی کہہ کر وہ خدا کے دین کو دنیا کے اور دوسرے شخصی مذہبوں کی طرح ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسلامیات کا کوئی بھی حقیقت پسند طالب علم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی باتیں حقایق کو گمراہ اور مسخ کرنے کی کوشش ہیں۔

شاخت کے نظریات کی اصلی غلطی، شاخت کے مذکورہ بالا دعوؤں کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ ان کے اس تجزیہ میں دو جگہ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔

اوّل تو یہ کہ انھوں نے اپنے مطالعہ میں عقلی اور منطقی طرز فکر کو راہ نہیں دی، ورنہ ان کا نتیجہ فکر یقیناً برعکس ہوتا۔

دوسرے یہ کہ اپنے نظریہ کو ثابت کرنے میں انھوں نے اسلام کے مصدر اول قرآن مجید سے اعتنا نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآن مجید کی پیش کردہ حقیقتوں سے لاعلم رہے،

عقلی پیمانہ سے اگر شاخت نے حقیقتوں پر نظر کی ہوتی یہ مسلّمہ صداقت صاف عیاں تھی، کہ جب معاشرہ میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدریں بدلتی ہیں اور لوگوں کے نظریہ اجتماع میں تبدیلی آتی ہے تو زندگی کے تمام قوانین، رسوم اور لوازم میں بھی انقلاب آجاتا ہے، تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ اسلام نے جب دور جاہلیت کے تمام فرسودہ نقوش کو مٹا دیا، اور انسانوں کو ایسے آداب و رسوم سے روشناس کرایا جو ماضی کی بہ نسبت زیادہ مہذب زیادہ معقول اور زیادہ مفید تھے، تو پھر اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایک نیا تشریعی نظام دے، یہ تو واضح اور منطقی بات ہے کہ ایک نئے اور اسلامی معاشرہ کے لیے رسول اللہؐ نے تشریع کی ضرورت محسوس کی، لیکن شاخت نے اس سادہ عقلی اور منطقی حقیقت سے قطعی اعراض کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علمی مفروضوں کی ساری عمارت ہی کج بنیاد ہوگئی، اس کے ساتھ ہی انھوں نے دوسری بنیادی غلطی یہ کی کہ

قرآن مجید سے انہوں نے تجاہل اور صرف نظر کا معاملہ کیا، ہم سمجھتے ہیں کہ ان سے اس غلطی کا ارتکاب عمداً ہوا ہے، کیونکہ یہ حقیقت سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ایسی کتاب دی جس کے لفظی اور معنوی مشتملات میں کوئی شبہہ نہیں اور جس کے مضامین میں آغاز سے آج کے دور تک نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ تحریف ہوئی، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ قرآن مجید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک متشکک یا دوسرے لفظوں میں ایک غیر مسلم، قرآن مجید کے منزّل من اللہ ہونے سے انکار کرے، تاہم وہ جب بھی اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں بحث کرے گا تو قرآن مجید کے مطالعہ سے وہ بھی بے نیاز نہ ہو سکے گا۔

انصاف کہتا ہے کہ اسلامی علوم کے ہر غیر مسلم طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس نکتہ کو ہمہ وقت ملحوظ نظر رکھے کہ اس کے مذہبی خیالات اور مسلمانوں کے معتقدات میں بہر حال فرق ہے اگر اس کا موضوع تحقیق اسلامیات ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے اعتقادات کی روشنی میں اپنی راہ تحقیق طے کرے،

عام طور سے مستشرقین کی تحریروں میں اس غلط روش اور خلط مبحث کا احساس ہوتا ہے، کہ یہ لوگ اسلامی پس منظر میں علمی بحث نہیں کرتے، بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی نقطۂ نظر کے متعلق یہ باور کرائیں کہ وہی مسلمانوں کا بھی زاویۂ نظر ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بحث و تحقیق میں عجیب وغریب اور ناقص و متضاد نتائج سامنے آتے ہیں۔

کیا شریعت کا تعلق قرآن مجید سے نہیں ہے؟

شاخت نے اسلامی شریعت میں حدیث کے مرتبہ و مقام کو جس طرح مجروح کیا ہے، اس کی تفصیل تو آئندہ آئے گی، ہم یہاں ذرا اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا واقعی قانون اور شریعت، قرآن کی روشنی میں، دائرۂ دین سے خارج ہیں، اس سلسلہ میں ہم نے چند

آیتیں اوپر ذکر کی ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی چند آیات یہاں درج کر دی جائیں، مثلاً:

۱- وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۵۵)

اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا بڑی خیر و برکت والی، سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو،

۲- اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (نساء: ۱۰۵)

بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے، واقع کے موافق، تاکہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے،

۳- وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ (یونس: ۱۰۹)

اور آپ اس کا اتباع کرتے رہیے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے، اور صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دیں گے،

۴- اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، (نور: ۵۱)

مسلمانوں کا قول تو جب کہ ان کو اللہ کی اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔

۵- اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان

أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ (نساء: ۶۰)

بھی رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں۔

۶- أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ (آل عمران: ۲۳)

کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، اور وہی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے ان کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے پھر ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی سے۔

۷- وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا (نساء: ۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، اور رسول کی طرف، تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

۸- قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ

یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ

لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (یونس: ۱۵)

ترمیم کر دیجیے، آپ یوں کہہ دیجیے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں، بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہونچا ہے۔

۹- وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (مائدہ: ۴۴)

اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔

۱۰- وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (مائدہ: ۴۵)

اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھا رہے ہیں۔

۱۱- وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (مائدہ: ۴۷)

اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے ہیں۔

ان تمام آیتوں کی روشنی میں مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱- ایک، تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تشریع کا حق اپنے لیے خاص کر لیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تشریع کے نفاذ کا حق و اختیار دیا۔

۲- دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر معاملہ میں اپنے احکام کی بجا آوری کو لازم قرار دیا ہے، اور اس کے لیے مسلمانوں سے مکمل سپردگی کا مطالبہ کیا ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ اسلامی شریعت، زندگی کے ہر پہلو کو شامل ہے۔

۴۔ اور آخری بات یہ کہ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام میں کسی کو تغیر و تبدّل کا حق نہیں، خواہ وہ پیغمبر ہو، فرشتہ ہو یا کوئی اور ہو۔

ہم نے جب قرآن مجید کا اس حیثیت سے مطالعہ کیا کہ اس کے احکام، زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں تو ہم نے یہ احکام چھ طرح کے پائے، جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ عبادات، جس میں ایک رکن زکوٰۃ ہے، اور جس کا تعلق مالیات سے ہے،

۲۔ دین کی اشاعت کی غرض سے جہاد، جس میں ضمناً حکومت کے قوانین اور ضابطے شامل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ معاشرتی نظام، اس میں فرد اور خاندان دونوں شریک ہیں۔

۴۔ کھانے پینے کے آداب و احکام،

۵۔ معاملات و حقوق سے متعلق احکام،

۶۔ جرائم اور ان کی سزائیں۔

یہاں ہم قرآن کے احکام اور آیات سے متعلق ایک مفصل جدول پیش کرتے ہیں، جس سے یہ بات زیادہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے، کہ قرآن کی تعلیمات، کس طرح زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرتی ہیں، بعض انصاف پسند مستشرقین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تورات میں جو تشریعی احکام ہیں، وہ عالمی ادب میں قانون کے نام سے معروف ہیں، لیکن قرآن مجید کے تشریعی احکام، تورات کے احکام سے کم نہیں ہیں۔[1]

مندرجہ ذیل جدول اس حقیقت کی غماز ہے کہ اصلاً دعوت الی اللہ اور غیر مسلمین سے مجادلہ اور انبیاء کے واقعات اور سیرۃ رسولؐ کے مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود قرآن نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو کس درجہ اہمیت دی ہے۔

[1] اسٹڈیز ان اسلامک ہسٹری، ڈی. ایس گولے ٹائن ص ۱۲۸۔

احکام والی سورتیں	عبادات	جہاد ملکی قانون	معاشرتی نظام	آداب طعام	بیوع	جنایات	قضا	شہادات	عقوبات مالی اور بدنی
۱۔ بقرہ	۲۹	۱۰	۲۳	۴	۹	۰	۰	۳	۵
۲۔ آل عمران	۲	۰	۰	۰	۱	۰	۱	۰	۰
۳۔ نساء	۸	۷	۵۰	۰	۰	۲	۵	۳	۷
۴۔ مائدہ	۹	۰	۵	۲۰	۰	۶	۵	۰	۶
۵۔ انعام	۱	۰	۰	۹	۰	۰	۰	۰	۰
۶۔ اعراف	۴	۰	۰	۲	۰	۰	۰	۰	۰
۷۔ انفال	۱	۱۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۸۔ توبہ	۹	۲۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۹۔ ہود	۱	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۰۔ ابراہیم	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۱۔ نحل	۰	۱	۰	۴	۰	۰	۰	۰	۰
۱۲۔ اسراء	۱	۱	۳	۰	۱	۰	۰	۰	۱
۱۳۔ طٰہٰ	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۴۔ حج	۰	۳	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰
۱۵۔ مومنون	۵	۰	۴	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۶۔ نور	۰	۰	۱۴	۰	۰	۰	۴	۱	۵
۱۷۔ فرقان	۰	۰	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۰
۱۸۔ نمل	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰		۰

احکام والی سورتیں	عبادات	جہاد ملکی قانون	معاشرتی نظام	آداب طعام	بیوع	جنایات	قضا	شہادات	عقوبات مالی اور بدنی
۱۹۔ عنکبوت	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۰۔ روم	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۱۔ لقمان	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۲۔ احزاب	۲	۰	۸	۰	۰	۰	۱	۰	۰
۲۳۔ فاطر	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۴۔ فصّلت	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۵۔ شوریٰ	۱	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۶۔ محمد	۰	۵	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۷۔ فتح	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۸۔ حجرات	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۹۔ مجادلہ	۲	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۰۔ حشر	۰	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۱۔ ممتحنہ	۰	۵	۴	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۲۔ صف	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۳۔ جمعہ	۱	۰	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۰
۳۴۔ طلاق	۰	۰	۵	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۵۔ مزمّل	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۶۔ مطففین	۰	۰	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۰
۳۷۔ بیّنہ	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
مجموعی احکام	۸۹	۷۴	۱۲۱	۴۰	۱۳	۹	۱۶	۷	۲۴

اس ساری تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ جس شریعت کو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، اس میں یا تو نئے قوانین وضوابط ہیں یا پھر اس میں زمانہ جاہلیت کے رسوم ورواج اور اس دور کے مروجہ قوانین کے بالکل برخلاف ایسے آداب ورسوم کی تعلیم ہے، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین و کامل ترین شکل میں لوگوں تک پہونچایا اور اسلامی معاشرہ میں ان کو جاری وساری کیا،

تشریع کی اہمیت میں، بعض مستشرقین کی رائیں

تشریع اور اسلام کے نظام قانون کی اس اہمیت کا بعض مستشرقوں نے بھی کیا ہے، مثلاً کولسن کا قول ہے کہ "اسلام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد قانون ساز ہے، اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسی کے احکام کا غلبہ ہے۔"[۱]

فیز جیرالڈ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "اسلام، اللہ تعالیٰ کو واحد قانون ساز وصاحب تشریع قرار دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی کو بھی اس کا شریک نہیں گردانتا۔"[۲]

گوائے ٹائن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دقیق قانونی معاملات بھی دین سے مربوط ہیں، بلکہ وہ وحی الٰہی کا ناقابل تقسیم حصہ ہیں، شریعت، ایسے عصری تقاضوں کا مجموعہ نہیں ہے جو قرآن اور نبی کریمؐ کے بعد مرتب ہوئے ہوں، بلکہ اسلامی معاشرہ میں ان کا باضابطہ نفاذ خود رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں کیا۔"[۳]

ان قرآنی آیات اور مستشرقین کے اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاخت کا یہ بنیادی نظریہ کہ شریعت دین کے دائرۂ اثر سے خارج ہے، یہ محض ان کا خیال خام ہے، اور قرآن مجید سے ان کی لاعلمی اور تجاہل کا غماز بھی ہے،

ایک اہم نکتہ

یہاں یہ بات بھی محل غور ہے کہ شاخت کے اس نقطۂ نظر سے دوسرے مستشرقین مثلاً

[۱] اے ہسٹری آف اسلامک لا، کولسن ص ۲۰، [۲] دی ایلیجڈ ڈٹ آف اسلامک ٹو رومن لا، فیز جیرالڈ ج ۶۷ ص ۸۲، [۳] اسٹڈیز ان اسلامک ہسٹری، گوائے ٹائن ص ۳۰ - ۱۲۹۔

فیز جیرالڈ، کولسن اور گوائے ان متفق نہیں ہیں، تاہم یہ عجیب معاملہ ہے کہ یہ مستشرقین جزئیات میں اور بعض بنیادی مسائل میں باہم اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں، ایک دوسرے پر تنقید بھی کرتے ہیں، لیکن ان اختلافات اور اعتراضات کی صدائے بازگشت صرف اسی حد تک سنی جاتی ہے، ناقص اصولوں سے مستنبط کی ہوئی غلط رایوں اور باطل نتائج پر یہ لوگ معترض نہیں ہوتے، مثلاً کچھ مستشرق یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ شاخت نے اپنے اس بنیادی نقطہ نظر میں غلطی کی ہے، مگر شاخت جب اسی غلط بنیاد پر تفصیل سے اپنے نتائج فکر کو پیش کرتے ہیں تو یہ مستشرق اس کو رد نہیں کرتے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جب وہ شاخت کے بنیادی مفروضہ کو غلط سمجھتے ہیں تو پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر ان کے استنباط اور ان سے مرتب کیے ہوئے نتائج کو بھی رد کر دیتے، مگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں، بلکہ کولسن نے تو نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ شاخت کا نظریہ اپنے وسیع تر پس منظر میں کسی بھی رد و اعتراض کو قبول نہیں کرتا ہے، اور ہر مستشرق کے لیے یہ ضروری ہے کہ شریعت کو مہمل ثابت کرنے کے لیے شاخت کے نظریہ سے استفادہ کرے۔

شاخت کے دعویٰ کی تاریخ اسلام سے تردید

شاخت اور ان کے ہمنواؤں کے مذکورہ بلند آہنگ دعویٰ کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے ہم قدرے تفصیل کے ساتھ یہ دیکھیں گے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ایک نیا ضابطہ و قانون پیش کیا، اور خدا کے اوامر و نواہی اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مطالبہ کیا، اور ایسے قانونی ضابطوں اور اخلاقی اصولوں کو پیش کیا جن کے دائرہ کار و اثر میں زندگی کے سارے گوشے شامل ہیں تو کیا یہ دعوے محض نظری اور قولی ہیں، یا واقعۃً زندگی کی حقیقتوں سے منطبق ہوتے ہیں؟

اسلامی تاریخ کی روشنی میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ روز اول سے اپنے صفحات میں ایسے واقعات کو سموئے ہوئے ہے جو قرآن کریم کے احکام و مطالبات کے عین مطابق ہیں، اور نظری لحاظ سے بھی اس کی متعدد مثالیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امراء و عمال کو ہمیشہ یہ ہدایت دی کہ وہ لوگ جب معاملات

کا فیصلہ کریں تو ان کا ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق ہو، ایک خط میں آپؐ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو تمام معاملات میں اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اللہ کے حکم کے مطابق حق بات کا فیصلہ کریں،[۱] آپؐ کے جانشین صحابہؓ و خلفاءؓ کرام کا بھی یہی عمل رہا، چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت معاذؓ کو لکھا کہ آپ حضرات، صالح لوگوں کو نظر میں رکھیں، اور ان کو عہدہ قضا پر مامور کریں، اور باضابطہ ان کو تنخواہیں دیں،[۲]

عملی لحاظ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاضی اور حکم کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، آپؐ کی اس حیثیت کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝ (احزاب: ۳۶)

اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اسکا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو انکے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانیگا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

رسول اللہؐ کے عہد مبارک میں آپؐ کے حکم سے بعض صحابہ کرامؓ نے قضا کی ذمہ داریاں سنبھالیں جن میں چند ممتاز یہ ہیں: ۱۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، ۲۔ ابی بن کعبؓ، ۳۔ حذیفہ بن الیمانؓ، ۴۔ دحیۃ الکلبیؓ، ۵۔ زید بن ثابتؓ، ۶۔ عبداللہ بن مسعودؓ، ۷۔ عتاب بن اسیدؓ، ۸۔ علی بن ابی طالبؓ، ۹۔ عقبہ بن عامرؓ، ۱۰۔ عمر بن الخطابؓ، ۱۱۔ عمرو ابن حزمؓ، ۱۲۔ عمرو بن العاصؓ، ۱۳۔ معاذ بن جبلؓ، ۱۴۔ معقل بن یسارؓ۔

اس ابتدائی دور میں ہی تشریع و قضا اور فقہ کا کام اس قدر وسیع ہو گیا کہ باقاعدہ ان قضایا کی ترتیب و تالیف کا عمل بھی شروع ہو گیا، چنانچہ امام طاؤسؒ (۳۰ھ، ۱۰۰ھ) نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے فتاویٰ کی ایک کتاب نقل کی۔

[۱] الوثائق السیاسیۃ، حمید اللہ، وثیقہ ۱۰۵، [۲] سیر اعلام النبلاء، ج ۱ ص ۳۲۶۔

حضرت معاذؓ بن جبل کے یمن کے فتووں کی طرح ان کے شام کے فتاویٰ کی بھی تدوین ہوئی[1]، اسی طرح حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت علیؓ کی فقہی رایوں کو مدون کیا گیا، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اور حضرت عبد اللہؓ ابن عباسؓ کی فقہ کو باقاعدہ مرتب کیا گیا[2]، پھر تابعین میں ابراہیم نخعیؒ، ابو قلابہؒ، شعبیؒ، ضحاک بن مزاحمؒ اور سلیمانؒ بن یسار کی کتابیں مرتب کی گئیں[3]، ان ساری تاریخی، نظری اور عملی شہادتوں کی موجودگی میں شاخت کے اس نظریہ کی کیا وقعت رہ جاتی ہے کہ تشریع اور قانون اور فقہ، دین کے دائرہ سے خارج ہیں، اگر شاخت کا دعویٰ محض یہ ہوتا کہ اسلام نے شریعت کو اور نظام قانون و فقہ کو نظری اعتبار سے تو پیش کیا لیکن عملی زندگی کے تقاضوں سے وہ مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکا تو بھی ہم تاریخی شواہد کی بناء پر اس کی تردید کرتے لیکن ستم یہ ہے کہ انھوں نے تشریع یا قانون و فقہ اسلامی کی تردید میں بالکلیہ یہ فیصلہ کر دیا کہ ایک بھی حدیث ایسی نہیں ہے جس کی نسبت صحیح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی جا سکے، اس طرح انھوں نے ہزارہا متصل السند احادیث کا ہی انکار کر دیا، اگر شاخت کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس سارے مجموعۂ احادیث اور اسانید و اصحاب اسانید کے بارہ میں کیا فیصلہ کیا جائے گا، اور اس سارے ذخیرۂ کتب کا کیا حشر ہوگا جو فقہ و حدیث کی ہزاروں کتابوں پر مشتمل ہے[4]۔

چونکہ شاخت، فقہ کی نشو و نما اور احادیث نبویہ کی اہمیت کے منکر ہیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے فقہ اسلامی کے ذخیرہ کے متعلق اپنے کچھ جدید نظریات پیش کیے ہیں، اس لیے آئندہ سطور میں ہم ان نظریات کا ایک جائزہ لیں گے۔

(باقی آیندہ)

---

[1] محدث فاضل رامہرمزی، [2] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۳۳، [3] دیکھیے مضمون نشأۃ المکتبۃ الفقہیۃ فی الاسلام، مصطفیٰ الاعظمی فی مجلۃ دراسات کلیۃ التربیۃ جامعۃ الریاض ۱۳۹۸ھ [4] بقول حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ بجا طور پر مغرب کے تبحر علمی کی شرمناک مثال ہے، (ع - ص)

یادِ رفتگاں

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یادِ رفتگاں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اُن تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اپنی زندگی میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۲ء تک برابر قلمبند کرتے رہے، اس میں انھوں نے اپنے اساتذہ کی وفات پر ماتم کیا ہے، اپنے پیر طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے وصال پر اُس فراق اور مہجوری کی کیفیت بیان کی ہے، جو ایک وفاکیش اور انتہائی عقیدت مند مرید پر طاری ہونی چاہیے، وہ اپنے ممتاز معاصر علماء کی موت پر گریہ کناں ہوئے ہیں، اپنے دوست علماء کی جدائی پر اشک بہایا ہے، اپنے سے چھوٹے علمی عزیزوں کی مفارقت پر اپنی سوگواری کو نذرِ قلم کیا ہے، ملک کے اُن مشاہیر کی رحلت پر اپنے سوزِ غم کا اظہار کیا ہے، جن سے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے متاثر ہوئے، ان کے زمانہ میں جو باکمال فضلا اور شعرا عالم جاودانی کو رخصت ہوئے، ان سے متعلق بھی اپنے غمناک جذبات کو احاطۂ تحریر میں لائے ہیں، اُن سیاسی رہنماؤں کی دائمی جدائی پر بھی انتہائی طور پر دلگیر اور دل گرفتہ ہوئے ہیں، جو ان کی نظر میں سچے معنوں میں ملک و ملت کے سچے غم گسار تھے، اس طرح اس پوری کتاب میں ان کے قلم کی سیاہی کی بوندیں ان کی معصوم اور طاہر آنکھوں کے آنسوؤں میں منتقل ہو کر کاغذ کے صفحات پر ٹپکتی نظر آتی ہیں، اور یہ ان کے خاموش آہ و فغاں اور نالہ و شیون کا ماتم نامہ بن گئی ہے، اس میں بعض ہندوؤں اور مستشرقین کی وفات پر بھی مغموم ہوئے ہیں، جس سے ان کی

رواداری اور فراخدلی کا ثبوت ملتا ہے، اسلامی ممالک کے بعض مشاہیر کی وفات پر بھی اپنے غمناک جذبات کو ظاہر کر کے اپنی بین الاقوامی وسیع النظری کا اظہار کیا ہے۔

سید صاحبؒ اپنی اور تصانیف میں تو مصنف کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، مگر اس کتاب کے ذریعہ سے ان کی ذات، اور شخصیت اور پھر ان کے اندرونی جذبات و احساسات اور علمی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ان کے نظری اور فکری خیالات کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لئے اس کا مطالعہ کئی حیثیتوں سے کئے جانے کی ضرورت ہے، مثلاً انھوں نے اپنے اساتذہ کی تعظیم و تکریم کس طرح کی، اپنے پیر طریقت سے اپنی شیفتگی اور وارفتگی کس کس طریقہ سے دکھائی، اپنے سے عمر میں بڑے معاصر علما اور اپنی عمر کے برابر علما کو کن نظروں سے دیکھتے رہے، اپنے سے چھوٹے علمی عزیزوں کے ساتھ کس بزرگانہ برتاؤ کے ساتھ پیش آئے، عالم ہونے کے باوجود غیر عالم فضلا اور شعرا کی قدر و منزلت کس طرح کی، اپنے دور کے مشاہیر سے عقیدت و محبت کن اسباب کی بنا پر رکھتے تھے، ان کی کن خوبیوں سے متاثر ہوئے اور ان کے محاسن کے بیان کرنے میں ان کا قلم کس طرح رواں ہوا، سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کس طرح کام کرتے رہے، اور ان کی عزت اور قدر ان کے دل میں جو رہی اس کا اظہار کس طرح کیا ہے، ہندوؤں کے مشاہیر کی موت پر ان کی وطنی محبت کس طرح دکھائی دیتی ہے، اپنے دور کے مستشرقین کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے، اسلامی ممالک کے کن مشاہیر سے متاثر رہے، اپنی ان تمام باتوں کو قلمبند کرنے میں انھوں نے کون سی زبان اور کون سا بیان اختیار کیا، اور مجموعی حیثیت سے اس پوری کتاب کی کیا قدر و قیمت ہے، یہ کتاب بظاہر وفات نامہ ہے، مگر اس کے اندر سید صاحبؒ جس طرح چھپ کر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی اس کی اصلی خوبی ہے۔

اساتذہ کا احترام وہ جب اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے سروں پر ادب و احترام کا

چتر لگائے ہوئے مودب اور مہذب بنے کھڑے دکھائی دیتے ہیں، ابتدائی تعلیم پھلواری شریف میں حضرت شاہ محی الدینؒ سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ (المتوفی ۱۹۴۷ء) کی نگرانی میں پائی، ان کے بزرگانہ تبسم ایک ساتھ طعام کی سعادت مندی اور درسی کتابوں کی شاگردی کو برابر یاد کرتے رہے، پھلواری شریف ہی میں مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ (المتوفی ۱۳۵۴ھ) سے منطق کے کچھ سبق پڑھے، ان کے حالات لکھنے میں، ان کی شیریں گفتاری، بذلہ سنجی، شعر گوئی، وسیع المشربی، اہل بیت سے خوش عقیدگی اور لطیفہ گوئی کا ذکر مزے لے لے کر کیا ہے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) بھی ان کے استاد تھے، ان کی وفات پر قدیم فلسفہ، منطق اور ریاضیات میں ان کے دسترس کی تعریف کی اور ان کی تصانیف میں تصریح الافلاک کے حاشیہ کا ذکر خاص طور سے کیا۔ ندوہ کے ناظم مولانا عبدالحئیؒ (المتوفی ۱۹۲۳ء) سے مقامات حریری پڑھی، تو ان کے علمی تبحر، ادبی ذوق، کثرت تصانیف اور ندوہ کی خدمت میں ان کے ثبات و استقلال کے معترف رہے، وہ اپنے استادوں میں علامہ شبلی نعمانیؒ (المتوفی ۱۹۱۴ء) کو اپنا بہت بڑا مربی، محسن، علمی قائد سمجھتے تھے، ان کی قدر نہ صرف یگانہ روزگار مجموعہ علم و فن شاعری کا کہنہ مشق استاد، تحریر اور تقریر یعنی انشا پردازی اور زبان آوری دونوں کا کشور کشا اور سخن سنجی کے طائر کمال کی حیثیت سے کی، بلکہ اپنی شیفتگی اور وارفتگی میں یہ بھی تحریر فرمایا:

"ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے علوم و فنون میں جو بالیدگی پیدا کی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم مختلف دوروں میں کلام و اسرار شریعت میں بحر العلوم اور شاہ ولی اللہؒ، ادب و معانی میں قاضی عبدالمقتدر ملک العلماء دولت آبادی اور ملا محمود جونپوری، فلسفہ و منطق میں ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ بہاری، ادب و شاعری میں مسعود سعد سلمان خسرو اور فیضی، تاریخ و سیر میں ضیاء برنی

ابوالفضل اور آزاد بلگرامی کو پیدا کیا، لیکن اس کی آغوش کا آخری فرزند شبلی وہ
تھا، جو ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی تھا اور آزاد بھی اور کم از کم وہ
یگانہ انفراد" ان میں سے شروع کے دو ایک کو چھوڑ کر اکثر کے برابر اور مجموعۃً
ان میں سے اکثر سے بہتر تھا۔ (یادِ رفتگان صفحہ ۱۶-۱۱ مطبوعہ معارف پریس)

یہ محض جذباتی تحریریں نہ تھیں، یہ ان کے قلم سے جوانی کے عالم میں ۱۹۱۶ء میں نکلی تھیں، جب وہ اپنی یہ کتاب یادِ رفتگاں ۵۳-۱۹۵۲ء میں مرتب کرنے لگے تو اس کی ابتدا اسی مضمون سے کی، اور اس میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی بالغ نظری اور دیدہ وری کے زمانے میں اسی کے قائل تھے جو اپنی جوانی کی سرشاریوں میں لکھ گئے تھے، اور اسی ایجاز کا اطناب ان کی حیاتِ شبلی میں ملے گا، وہ اپنے اساتذہ سے اپنی فریفتگی کا اظہار کر کے نہ صرف اپنی شاگردانہ سعادت مندی کا ثبوت دیتے رہے بلکہ یہ سب کچھ لکھ کر نئی نسلوں کو اپنے اساتذہ کے ساتھ اسی سعادت مندی کا درس دیتے رہے۔

پیر طریقت سے وارفتگی سید صاحبؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ المتوفی ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کے آستانے پر اس وقت جھکے جب وہ خود علم دین کے ایک شہباز، گلشن رسالت کے ایک عندلیبِ خوشنوا، اور بقول علامہ محمد اقبال استاد الکل اور جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد بن چکے تھے، مگر ان کے سامنے اپنا سرِ تسلیم اس لیے خم کیا کہ ان کی نظر میں وہ مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی یادگار تھے، ان کی ذات میں حضرات چشتیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبتیں یکجا تھیں، ان کے خیال میں ان کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، ان کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، ان کے قلم نے نقد و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کر دیا تھا۔

اور ان کو اس پر یقین راسخ تھا کہ ان ہی کے فیض و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے حقایق ایمانی و دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموزِ حکمتِ ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اسی لئے دنیا نے ان کو حکیم الامت کہہ کر پکارا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کے لیے یہ خطاب عین حقیقت تھا، (یادِ رفتگان صفحہ ۲۵۴)

اس عقیدت کے بعد ان کی ذات اقدس سے شیفتگی اور وارفتگی کیوں نہ پیدا ہوتی۔

یوپی کے علماء سے لگاؤ سید صاحبؒ کی بیشتر زندگی یو۔پی میں گذری، اس لیے یہاں کے علماء کے ساتھ قریب تر رہنے کی وجہ سے ان کے فضائل کو جاننے اور پرکھنے کا موقع ملا، اس کے علاوہ ان کا یہ بڑا وصف رہا کہ علماء کے محاسن پر ان کی نظر اس طرح جاتی جس طرح ایک اچھے جوہری کی نگاہ قیمتی جواہرات پر جاتی ہے، ان کے اوصاف کا ذکر کر کے اپنی اس پنہاں مسرت کو آشکارا کرتے کہ ان کا تعلق بھی اسی قابلِ فخر طبقہ سے ہے، وہ ندوی تھے، دیوبند اور ندوہ میں بڑا ذہنی تفاوت رہا ہے، مگر سید صاحبؒ نے دیوبند کے علماء کے مناقب بیان کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

دیوبند کے علماء کے فضائل کا اعتراف وہ دیوبند کے مفتی عزیز الرحمٰن المتوفی ۱۹۲۸ء کے اس لئے قدرداں تھے کہ تقویٰ اور دینداری ان کے چہرۂ کمال کا خط و خال تھی، کتب فقہ کی جزئیات پر ان کی وسعت نظر بدرجۂ اتم تھی، فتوٰی کے جوابات مختصر لیکن مدلل دیتے تھے۔ (ایضاً۔ ص ۸۸)

دیوبند کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی المتوفی ۱۹۲۹ء کی قدر اس لئے کی کہ وہاں کی روح بن کر رہے، عالم متبحر ہونے کے علاوہ عربی کے ادیب بھی تھے، عربی نظم و نثر

دونوں پر ان کو قدرت حاصل تھی، سید صاحبؒ ان سے برابر ملتے رہے، آخری بار جب ان سے ملے تو اس کی یاد بڑی حسرت سے یہ لکھ کر کی کہ ضعف اور لاغری سے فضل و کمال کا یہ ماہِ درخشاں اب ہلال بن کر رہ گیا تھا، اب یہ ہلال بھی محاق ہو کر دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا۔ (یادِ رفتگاں ص ۹۳) یہ دو سطریں کاہے کو ہیں، قلم اور قدر دانی کے چقماق کی چنگاریاں ہیں۔

مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ (المتوفی ۱۹۳۳ء) دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے جانشین تھے، اور وہاں صدر مدرس بھی رہے، اپنے علم و فضل کی وجہ سے علماء کی آبرو تھے، چین و ہندستان سے روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں مارتا رہا، سید صاحبؒ نے ان کو دین و دانش کا مہرِ انور کہہ کر ان کا ماتم اس طرح کیا۔

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند، زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔" (ایضاً ص ۱۴۶)

وہ سید صاحبؒ کی تصنیف ارض القرآن کو پسند کرتے تھے، جو سید صاحبؒ کے لیے بہت بڑی سند ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۷)

مولانا الیاس کاندھلویؒ (المتوفی ۱۹۴۴ء) کا ذکر خیر کرنے میں سید صاحبؒ پر جو انشراحی کیفیت طاری ہوئی، تو ان کا قلم ایک لمبی تحریر لکھنے کے بعد ہی رکا، جس میں ان کے وطن کاندھلہ، ان کی تعلیم، بیعت و استفاضہ، خاندانی شجرہ اور خود سید صاحبؒ سے ان کی ملاقاتوں،

پھر ان کے اخلاص، انکے درد، ان کی سادگی، دین کے ساتھ ان کی غم خواری، خدمت گذاری، تبلیغی کاموں میں مخلصانہ اصول دعوت کی کچھ ایسی حیرت انگیز تفصیلات ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت خواہش ہوتی ہے، کہ یہ ختم ہونے کے بجائے جاری رہے، اس کا انداز بیان کچھ ایسا ہی دلچسپ ہے، ان کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے، رقمطراز ہیں۔

"وہ اس عہد میں ان نفوس قدسیہ کی مثال تھے، جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا چراغ روشن ہوا، ان کا وجود اس دعویٰ کی کہ ہندوستان میں اسلام بادشاہوں کے تیغ و خنجر کے سایہ میں نہیں بلکہ بے نوا فقیروں کے فیوض و برکات کے زیر سایہ بڑھا اور پھلا پھولا، یہ سب سے تازہ دلیل ہے۔" (یادِ رفتگان ۲۷۹)

سید صاحبؒ نے میوات میں ان کے تبلیغی کاموں کی بڑی پُر کیف تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح میوات کے لڑاکے چوری ڈاکہ اور قتل میں بدنام مسلمان نیک، صالح اور دیندار مسلمان بن گئے، اور پھر اپنے طبقۂ علماء کے ان کارناموں سے اپنی خوشی کا اظہار پورے زور بیان کے ساتھ کیا ہے، سلاطین اور بادشاہوں کی طاقت اگر روحانی طاقت سے محروم ہو تو اس ظاہری حکومت کا جاہ و جلال حق کی قوت کے بجائے باطل کی قوت کے فروغ کا سامان ہو جاتا ہے، لیکن باطن کی قوت ظاہری طاقت کی محتاج نہیں، اس لیے رشد و ہدایت کے مسند نشیں، تاج و کلاہ، فوج و لشکر کے بغیر اور زر و جواہر کے خزانوں سے بے نیاز ہو کر اپنی دلق مرقع میں اور اپنی شکستہ حصیر پر بیٹھ کر دلوں پر جو حکمرانی کرتے ہیں وہ بادشاہ اور سلاطین نہیں کر سکتے، مولانا الیاس کاندھلوی سید صاحب کی نظر میں دلوں ہی پر حکومت کرنے والے فرمانروا گزرے ہیں، کیونکہ ان کے روحانی آثار و برکات سے اس وقت نہ صرف یہ برصغیر بلکہ اس سے باہر کی دنیا بھی فیض یاب ہو رہی ہے۔

سید صاحب دیوبند کے مشہور عالم اور مفتی مولانا کفایت اللہ کی بھی بڑی قدر کرتے، اسی لیے کہ اور لوگوں کی طرح وہ بھی ان کو فقیہ الامت تسلیم کرتے، ان کے سفر حضر، سیاسی جلسوں، فقہی مجلسوں اور نجی صحبتوں میں برابر ملتے رہے، اور ان کے متعلق ان کا تاثر یہ تھا کہ ان کی ظاہری صورت اور متواضع لباس کی بنا پر قیافہ ان کے فضل و کمال سے حسن ظن پیدا نہ ہونے دیتا، مگر تھوڑی سی بات سے پتہ چل جاتا کہ اس غلاف کے اندر تلوار کیسی ہے (یادِ رفتگاں ص ۱۴۴)

اوپر جن بزرگوں کا ذکر آیا ہے، وہ سید صاحبؒ سے سن میں بڑے تھے، مگر مولانا شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۹۴۹ء) ان کے ہمسن تھے، ان پر جو ماتمی تحریر لکھی ہے، وہ بھی لمبی ہے، اور اس میں ان سے اپنے نصف صدی کے تعلقات اور ملاقاتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے، کہ ان کی بڑی دل آویز تصویر سامنے آجاتی ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:-

ان کے تقویٰ کا حال یہ تھا کہ ایک بار اعظم گڈھ آئے تو ان کو چائے پیش کی گئی، لیکن پینے سے انکار کیا کہ جاپانی پیالی پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، وہ پاکستان کے بانیوں میں سے ہیں، لیکن سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا، انھوں نے کراچی میں نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا، نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ اپنے بعض عقیدت مند اہل ثروت کے مکان میں رہے، اور اسی مسافرت میں اس مسافر نے اپنی زندگی گزار دی، سید صاحبؒ کو ان کی تقریر بہت پسند آتی، اس لیے کہ اس میں عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ تھے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے، جس سے محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی، وہ ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے، کہ خود نہیں ہنستے تھے، مگر دوسروں کو ہنسا دیتے تھے، ذہانت طباعی اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے نمایاں ہوتی تھی، وہ اکبر کے ظریفانہ

کلام کو اپنی تقریروں میں عمدگی سے کھپاتے تھے، انھوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمۂ قرآن پر حواشی لکھے ہیں، ان کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں" کہ ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی اور تفسیروں پر عبور اور عوام کے دل نشین ہونے کے لیے ان کی قوت تفہیم صد بیان سے باہر ہے، خود مولانا شبیر احمد سید صاحب کو بہت پسند کرتے، اسی لیے ان کے متعلق فرمایا کہ۔

"مجھے ان سے بہت انس ہے، اس لئے کہ یہ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک مفید اور متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں" (یادِ رفتگاں معارف پریس اعظم گڈھ، ص ۳۹۷)

سید صاحب بھی اپنی اس تعریف سے خوش تھے، ان کو بھی ان سے بڑا انس رہا، اسیلئے ان کی وفات پر لکھا کہ ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں (ایضاً ۴۰۳) کسی اور عالم نے اپنے ہمسر اور معاصر عالم کی ایسی تعریف شاید ہی کی ہو۔

فرنگی محل کے علمائے عقیدت مولانا محمد یونس فرنگی محلی (المتوفی ۱۹۲۲ء) کو دار المصنفین سے بڑا تعلق رہا، جب وہ چوبیس پچیس برس کے تھے، انھوں نے دار المصنفین کے لیے دو کتابیں روح الاجتماع اور ابن رشد کے نام سے لکھیں، اسی کے بعد جوانی میں ان کی موت ہو گئی تو سید صاحبؒ نے بہت مغموم ہو کر لکھا کہ مرحوم کے دوستوں کو ان سے بڑی توقعات تھیں، خیال تھا کہ ان کی کوششوں سے فرنگی محل کی عقلی اور فلسفیانہ شان پھر دوبارہ زندہ ہو جائے گی، افسوس کہ دست اجل نے ان کو امان نہ دی، انا للہ (یادِ رفتگاں صفحہ ۴۷۲)

مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ (المتوفی ۱۹۲۶ء) سے ان کے تعلقات مولانا شبلیؒ کے زمانے سے رہے، پھر طرابلس اور بلقان کی جنگ کے زمانے، کانپور کی مسجد کے ہنگامے، خلافت تحریک اور مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں ان کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے، ان کی خوبیوں کی

وجہ سے ان کی ذات گرامی سے بڑی شیفتگی پیدا ہوگئی تھی، اور گو حجاز کے مسائل میں سید صاحبؒ سے ان کا اختلاف ہوگیا تھا، مگر مولانا کی شفقت ان پر آخر وقت تک رہی، اور خود سید صاحبؒ کا اخلاص برابر قائم رہا، وہ ان کی گوناگوں خوبیوں کے معترف تھے، اسی لیے جب ان کی رحلت ہوئی تو عربی کے دو اشعار لکھ کر یہ ظاہر کیا کہ ان کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے، بلکہ پوری قوم کی بنیاد کا گر جانا ہے، ان کو وہ مجسمۂ علم و اخلاص اور فرنگی محل کی کہنہ عمارتوں میں فضل وکمال، ایمان و معرفت اور زہد و ورع کی آخری شمع سمجھتے رہے، اسی لیے ۴۵ سال کی عمر میں ان کی وفات پر اس طرح نوحہ کیا۔

"فرنگی محل کے متاخرین میں حضرت استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحیؒ کے بعد مولانا عبدالباری کی ذات نمایاں ہوئی تھی، جو بزرگ اجداد کی بہت سی روایات کی حامل تھی، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی علمی مناقب کے ساتھ دین وملت کی راہ میں ان کا جان فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہمرنگِ شہد تھا۔"

اپنے ذاتی تعلقات اور مراسم کی وجہ سے ان کی نجی زندگی کے حالات اور سیرت کے اوصاف سے بھی باخبر تھے، اس لیے یہ بھی لکھا کہ

"ذاتی اخلاص، جود و سخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی انکے اوصاف گران مایہ تھے، وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماویٰ، اور تنگدستوں کے دست گیر تھے، عبادت گذار، شب زندہ دار اور حق کے طلب گار تھے، ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علماء کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی۔ (یادِ رفتگان معارف پریس ص ۵۶)

ان کا اثر انگریزی تعلیم یافتوں پر غیر معمولی تھا، جس کا ایک بہت ہی نمایاں ثبوت یہ تھا کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی ان سے بیعت ہوگئے تھے، اسی لیے سید صاحبؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ

"جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا یقیناً ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لیے ان کی غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، بنا بریں ان کی جوان مرگی ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار ہوگا، شمع بجھ گئی، مگر اس کے دھوئیں کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر یہ ہمیشہ لکھا نظر آئے گا۔

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

اس ماتمی تحریر کی چند سطروں میں کیسی دردبھری تاثیر پیدا کردی ہے، ایسے غمناک جذبات کا اظہار طاہر دل اور پاکیزہ قلم ہی کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں سید صاحبؒ کو حاصل تھیں۔

سید صاحبؒ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی المتوفی ۱۳۴۱ھ کی عزت اس لئے کرتے تھے کہ ان کو معقولات اور منقولات پر یکساں دسترس حاصل تھی، اسی کے ساتھ مسائل پر وہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے، انھوں نے بھی سید صاحب کو اپنے سے قریب تر پایا، ان کی آخری علالت کے زمانے میں بھوپال سے لکھنؤ تک سید صاحبؒ کا ریل کا سفر ایک ساتھ ہوا، سید صاحبؒ سفر میں ان کی خدمت کرتے آئے، اور جب لکھنؤ اسٹیشن پر رخصت ہونے لگے تو سید صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ کی زحمتوں اور خدمتوں کا شکریہ اس لئے نہیں ادا کروں گا کہ میں آپ کو اپنے سے علٰحدہ نہیں سمجھتا، اس جملہ میں باہمی یگانگت و موانست کی ایک دنیا آباد ہے،

یو۔پی کے اور علماء کی قدر دانی،

دیوبند اور فرنگی محل کے علماء کے ساتھ سید صاحبؒ کی نظر یو۔پی کے اور خطوں کے علماء کی طرف بھی اٹھی رہی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (المتوفی ۱۹۱۸ء) کے اتباعِ سنت، طہارتِ طبع، تقویٰ اور کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر کی مہارت کو نظرِ تحسین سے دیکھتے رہے، (یادِ رفتگاں ص ۴۱) علی گڈھ کے مولانا رشید احمد انصاری (المتوفی ۱۹۲۲ء) کے ان ترجمات کے قدر داں رہے جو وہ عربی کی کتابوں سے کرتے رہے، (ایضاً صفحہ ۵۴) اور جب ۱۹۲۶ء میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی وفات ستائیس ۲۷ برس کی عمر میں ہوئی، تو سید صاحبؒ یہ کہہ کر چیخ اٹھے کہ ہماری جماعت کا لعلِ شب چراغ گم ہوگیا، اور پھر لکھا کہ آہ کس زبان سے کہیں، عبدالرحمٰن مرحوم دارالعلوم ندوہ نے اپنی تیس ۳۰ برس کی مدت میں جتنے کارآمد اور علم دین کے خادم پیدا کیے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عبدالرحمٰن سب میں بہتر تھا، اللہ تعالیٰ نے انکی ذات میں علم و عمل کی ساری خوبیاں جمع کر دی تھیں، یہ ایک ندوی عزیز کی محبت کی ایک سرشارانہ کیفیت ہے، جس سے ان کی پوری ماتمی تحریر بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

گورکھپور کے مولانا ابوالفضل عباسی (المتوفی ۱۹۲۶ء) نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا، اور پھر جو تاریخ اسلام اور قانون محمدی کی تصنیف کی اس سے ان کی نگاہ میں ان کی عزت تھی، (ایضاً صفحہ ۸۳) مولانا عبدالحئی سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۶ھ) کی شہرت اس لئے تھی کہ وہ عربی کے شاعر اور عربی ادب و امثال و محاورات کے بہت بڑے عالم تھے، سید صاحب نے بھی ان کی اس علمی شان کو تسلیم کیا۔ (ایضاً صفحہ ۹۰)

سید صاحبؒ نے جب اعظم گڈھ میں آکر قیام کیا تو وہ مولانا حمید الدین فراہی (المتوفی ۱۹۳۰ء) کے علم و فضل کے بے حد گرویدہ ہوئے، ان کو اپنے عہد کا ابن تیمیہ سمجھتے تھے۔ وہ مولانا شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی بھی تھے، اس لیے ان کی قدر دانی میں دو آتشہ کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، ان کا ساتھ ۱۹۱۳ء سے ان کی وفات نومبر ۱۹۳۰ء تک رہا۔

قرآن فہمی میں ان کے فہم، ادراک اور تدبر، عربی میں ان کے فضل و کمال، اور فارسی میں ان کی شیوا بیانی سے بہت متاثر ہوئے، ان کی وفات پر تیئس صفحے کا جو نثری نوحہ لکھا ہے، وہ یادِ رفتگاں کی سب سے لمبی تحریر ہے، اس سے ان کی ذات سے ان کی عقیدت و محبت کا اظہار ہوگا۔ اس میں ان کے حالات کے سلسلہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہی ان کی زندگی کا ماخذ دوسروں کے لیے بنا ہوا ہے، وہ ان کو کیا سمجھتے تھے، وہ ان کی حسب ذیل تحریر سے معلوم ہوگا۔ اگر یہ اقتباس طویل ہو جائے تو ناظرین گھبرائیں نہیں، بلکہ ان کے ذوقِ سلیم سے امید ہے کہ وہ اس کو غور سے پڑھیں گے۔

"الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن (مفسرِ قرآن کی نمازِ جنازہ) یہ وہ صدا ہے جو ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیوار تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی، حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو، اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ، ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ) اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

یہاں تک تو صرف ان کی موت کی خبر ایک خاص انداز میں دی گئی ہے، پھر ان کے تمام محاسن و مناقب کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آیندہ بظاہر حال عالمِ اسلام میں پیدا ہونے کی توقع نہیں، جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہدِ حاضر کا معجزہ تھا، عربی کا فاضلِ یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبلِ شیراز، عربی کا سوقِ عکاظ، ایک شخصیت منفرد لیکن ایک جہانِ دانش، ایک دنیائے معرفت، ایک کائناتِ علم، ایک گوشہ نشین مجمعِ کمال، اک بے نوا سلطانِ ہنر، علوم ادبیہ میں یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقفِ اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے

بے نیاز اہلِ دنیا سے مستغنی انسانوں کے رد و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا، اور گوشۂ علم
کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور
صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر، درس و تعلیم میں محو اور ہر شے سے بیگانہ ہو کر مشغول رہ کر آشنا تھی
سید صاحبؒ کو اس کا افسوس رہا کہ ان کا علم ان کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل
ہو سکا، مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اس کے چھپنے اور ربط و نظام دینے کا دماغ
اب کہاں، سید صاحب کو یہ بھی دکھ رہا کہ دنیا ان کی قدر و منزلت کو نہ پہچان سکی، اور
ان کے فضل و کمال سے ناآشنا رہی، مگر خود سید صاحب نے ان کا ماتم جس طرح کیا ہے، وہ ماتمی تحریر کا
ایک دلگداز نمونہ ہے، اور ایسی تحریر وہی لکھ سکتا ہے، جس کے دل میں سچی محبت، اصلی عقیدت
اور حقیقی اخلاص ہو، ورنہ تصنع، تکلف اور آورد کے ذریعہ ایسی عبارت نہیں لکھی جا سکتی ہے۔

سید صاحب نے جب یہ تحریر لکھی اُس وقت ان کی عمر چھیالیس سال کی تھی، خود عالم بے بدل
ہوتے جا رہے تھے، اس لئے وہی ایک یگانہ روزگار کے عارف ہو سکتے تھے، وہ خود علوم و
فنون کے جامع بنتے جا رہے تھے، اسلئے فضل و کمال کی جامعیت کے بھی قدرداں ہو سکتے تھے، انکو ماہر قرآنیات ہونا تھا
اسلئے علوم قرآن کے واقف اسرار اور دانائے رموز کا اور شناس ان سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا، انکی ان کیفیات کے
اظہار کیلئے جس قلم اور انداز بیان کی ضرورت تھی، وہ انکے ممدوح کی وفات سے خود بخود مل گیا جس سے اسکے پڑھنے والے
ہمیشہ محظوظ ہوتے رہیں گے۔

ڈپٹی کے اور جن علماء سے متاثر رہے، ان میں مولانا عبدالماجد بدایونی المتوفی ۱۹۳۲ء کا نام بھی نمایاں ہے، وہ انکی
قدر حسان زمانہ کی حیثیت سے کرتے تھے، انکے ساتھ سیاسی کاموں میں بھی رہے، مگر انکی اصلی خوبی سید صاحبؒ کی نظر میں یہ تھی

"ان کی ہستی سراپا محبت تھی، خدا سے محبت، رسول سے محبت، آلِ رسول
سے محبت، اکابر سے محبت، دوستوں سے محبت، کارکنوں سے محبت، اور

عزیزوں سے محبت۔ (یادِ رفتگاں معارف پریس ص ۱۳۹)

صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خان نواب سید صدیق حسن
خان کے چھوٹے بیٹے تھے، جنھوں نے بیگم بھوپال سے شادی کر لی تھی، اس لئے گھر میں امارت
آگئی تھی، مگر سر سید کی جدید تعلیمی تحریک اور ندوۃ العلماء کی مذہبی سرگرمیوں میں شریک
رہے، دار المصنفین کے اساسی ارکان میں تھے، آخر میں لکھنؤ آکر رہنے لگے تھے، جہاں ہر سنجیدہ
تحریک میں ان کا نام سرفہرست رہتا تھا، متعدد مذہبی اور تاریخی کتابوں کے مصنف ہوئے،
جن میں شعراء کا ایک تذکرہ، فطرۃ اسلام اور مآثر صدیقی مشہور ہیں، مولانا شبلیؒ کے بے تکلف
دوستوں میں تھے، اسی تعلق سے سید صاحبؒ سے ایک خاندانی بزرگ کی حیثیت سے ملتے،
تیس برس کی ملاقاتوں میں اپنی بزرگانہ محبت کی وضعداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا، سید صاحبؒ
نے ہر موقع پر ان کو مجسم اخلاق، حد درجہ پاک باطن، نیک طینت، شر و فساد سے نفور اور
ہنگامہ آرائیوں سے کوسوں دور، دولت کے باوجود خاکسار اور علم و فضل کے ساتھ حد درجہ ملنسار
پایا، اسی لئے ان کی وفات پر یہ لکھ کر ماتم کیا۔

نورمحل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم و چراغ اور ایک بڑے خاندان
کا چراغ سحر تھا، ۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم و فضل کا یہ
ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہوگا جہاں نور کے سوا
ظلمت کا گذر نہیں، صفی الدولہ حسام الملک اب تو وہاں ہے جہاں کسی کی دولت ہے اور
نہ کسی کا ملک ہے، تیرے اعمال نیک کی دولت اور تیرے کار خیر کی مملکت تیرے ساتھ ہے،
دعا ہے کہ وہ شہنشاہ علی الاطلاق اپنے ملک لازوال کی دولت جاوید سے تجھ کو سرفراز فرمائے"

یہ دل کی آواز تھی، جو تحریر میں منتقل ہو گئی،

سید صاحب مولانا ابوبکر شیث (المتوفی ۱۹۴۰ء) سے جب جب ملے ان کے ایسا
شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دوراندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، ایسا خوش اخلاق،
ایسا باغ و بہار، ایسا خنک رو کسی اور کو نہیں پایا، ان کی وفات پر جو تحریر لکھی اس میں یہ ان کی
یہ بات بہت ہی معنی خیز ہے

"موصوف سے میری ملاقات ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں ہوئی،
یہ ملاقات دوستی اور دوستی اتحاد کی اس منزل تک پہونچ گئی جس کے بعد خیال کی دوئی کا کوئی
مرتبہ نہیں رہتا، ایک دفعہ ہم نے کہا اور انھوں نے مانا تھا کہ ایک مذہب ہے جس کے
وہ بھی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال
سے تھا" (یاد رفتگاں ص ۱۱-۲۱)

اس تحریر سے سید صاحبؒ کے مزاج کی اعتدال پسندی اور میانہ روی کا اندازہ ہوگا۔
سید صاحبؒ مولانا معز الدین خیر آبادی (المتوفی ۱۹۴۳ء) کی فقیہانہ قابلیت کے مداح
رہے، مولانا سید محمد علیؒ الہ آبادی (المتوفی ۱۹۴۴ء) سے اسلئے محبت کرتے کہ وہ ان کے پیر بھائی
تھے، مولوی ضیاء الحسن علوی سابق رجسٹرار انسپکٹر مدارس یو.پی (المتوفی ۱۹۴۵ء) سے
اس لئے قلبی لگاؤ رکھا کہ ندوہ میں ان ہی کے ساتھ دستاربندی ہوئی، ان کو اپنے تعلیمی عہد
محبت کا نخل بار آور سمجھتے تھے، مولانا عمادیؒ ان کے بہت بڑے علمی دوست تھے، وہ ان کی
قدر ان کے علمی تبحر کے علاوہ اس لئے کرتے کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اپنی تعظیم و تکریم سے اس قدر
غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے کہ وہ اپنے ہی کو ان سے بڑا سمجھنے لگتے، مولانا یعقوب بخش قادری
بدایونی (المتوفی ۱۹۴۶ء) سے سید صاحب کی ایسی بے تکلفی تھی کہ وہ بدایوں سے وہاں کے
مشہور پیڑے ڈاک کے ذریعے بھیجا کرتے تھے۔

وہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی (المتوفی ۱۹۵۰ء) کو دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتے
جس طرح کوئی یونان کے کسی ماہر سنگ تراش کی سنگ تراشی کے شاہکار کو دیکھ کر خوش ہو،
ان کو پہلی دفعہ دیکھا تھا تو اس کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں،

"میں نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں نصف صدی پہلے پٹنہ کے
اجلاس ندوہ میں دیکھا تھا، بھرا شباب، موانہ حسن و جمال، سفید رنگ، سیاہ خوبصورت
داڑھی، سر پہ زلفین، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، اس جلسہ کے
ہر اجلاس میں نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پہ عمامہ، کبھی ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر
نکل جاتے، آنکھیں اٹھ جاتیں، انگلیاں اشارہ کرتیں، لوگ ایک دوسرے کو
دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح میں نے بھی دیکھا اور مجھے بتایا گیا کہ علی گڈھ کے
رئیس اعظم ہیں" (یاد رفتگاں ... معارف پریس اعظم گڈھ، ص ۴۱۱)

اس سراپا میں مثنوی نگاری کا رنگ پیدا ہوگیا ہے یہ سید صاحبؒ نے اپنی جوانی کے عالم
میں نہیں لکھا بلکہ اس وقت لکھا جبکہ انکی عمر چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی، ان کا قلم بوڑھا نہیں ہوا تھا،
بلکہ جوان اور رعنا ہی نظر آتا تھا، اس وقت اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کا قلم ان کو
چھوڑ رہا تھا، مگر وہ قلم کو نہیں چھوڑ رہے تھے، اسی لئے جب مولانا شروانی پر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا
تو ان کے قلم کی پرانی پختگی اور سحر طرازی ان کا ساتھ دینے لگی، جس کا اظہار اس پوری تحریر میں ہے،
سید صاحبؒ سے ان کی دید و شنید اور ملاقاتوں کی مدت نصف صدی تک پھیلی ہوئی،
وہ مولانا شبلیؒ کے ساتھ الندوہ کی ادارت کرتے رہے، ندوہ کے جزو بن گئے تھے، دارالمصنفین کی
مجلس انتظامیہ کے صدر رہے، سید صاحبؒ ان سے کس طرح ملتے رہے، ان ہی کی زبانی سنئے
جس سے خود ان کی سیرت کا بھی اندازہ ہوجائے گا۔

"میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرت الاستاذ مولانا شبلیؒ کے مخصوص احباب اور دوستوں سے بزرگ داشت کا تعلق رکھوں اور ہمیشہ ان کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھوں، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور ان کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، میں انھیں مخدوم لکھتا، وہ عزیز لکھتے، دارالمصنفین کی تاسیس میں مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہ نما رہی، دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی ان سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگوں کے محفوظ خطوط گنے، تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ ان ہی کے تھے، میں نے جب انھیں اس کی اطلاع دی تو اس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا۔ (یادِ رفتگاں ۔ ۔ ۔ ۔ ص ۴۱۳/۲)

یہ تحریر سید صاحبؒ نے اس وقت لکھی جب وہ اپنے زمانے کے بہت ہی مشہور مصنف اور عالم دین ہو چکے تھے، مگر تحریر لکھتے وقت اپنے کو ایک ادنیٰ اور چھوٹا عزیز سمجھنے پر آمادہ کیا۔ اور اپنے زمانے کے علمی بزرگ کے سامنے ہر طرح عجز و نیاز کے ساتھ جھکے نظر آتے ہیں، اسی سے ان کے اسلوب میں بھی خاص جان اور شان پیدا ہو گئی ہے، اس کے بعد جب وہ اپنی تحریر میں انکی غیر معمولی دلچسپی، قدیم و جدید تعلیم سے ان کی رغبت، تاریخ، سیر اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کی محبت، اپنے استاذ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ سے ان کے لگاؤ، شعر و شاعری سے ان کے پاکیزہ ذوق، قلمی کتابوں سے ان کے شوق، اخلاقی فضائل میں ان کی وضعداری، ملنے ملانے میں ان کی تہذیب و شرافت، نجی مجلسوں میں ان کی لطیفہ گوئی، اور شیوہ بیانی، نظام حیدر آباد کی

ملازمت کے زمانے میں ان کی خودداری، پابندی وضع، ملت اسلامیہ سے محبت مگر سیاست سے کنارہ کشی، بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی کا ذکر کرتے ہیں تو افسانہ نویس یا ناول نگار کی کردار نگاری کے آرٹ میں جو جوہر دکھائی دے سکتا ہے، وہی ان کی اس تحریر میں دکھائی دیتا ہے، پھر اس کے پڑھنے میں لطف اس لئے بھی دوبالا ہو جاتا ہے، کہ یہ ایک خاص رنگ کے یگانۂ روزگار کی کہانی ایک دوسرے رنگ کے یگانۂ روزگار کی زبانی ہے، کیسی حسرت سے لکھتے ہیں کہ

"علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ ان سے ملا تو میں نے دیکھا کہ ان کا تیر سا قد نیم کمان بن چکا تھا، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ اور مرجھایا تھا، اسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغ سحری بجھا ہی چاہتا ہے، (یادِ رفتگاں ۔ ۔ ۔ معارف پریس اعظم گڈھ ص ۲۱۳)

ان کی وفات چھیاسی سال کی عمر میں ۱۹۵۰ء میں ہوئی تو سید صاحبؒ کراچی جا چکے تھے، وہیں یہ خبر سنی، لکھتے ہیں کہ

"اگست کی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر پڑھی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہو گیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہو گیا۔ اور اپنی دوری، مہجوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا" اور آخر میں لکھتے ہیں۔

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ میں ہوائیں اور سمت کی چل رہی ہیں، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس آخری ٹکڑے میں کیسی خلش ہے، جو اسی کے دل میں ہوگی جس میں خود جوہرِ شرافت جگمگاتا رہتا ہے۔

بہار کے علماء سے تعلقِ خاطر

سید صاحبؒ بہار کے تھے، اس لئے فطری طور پر ان کو بہار کے علماء سے لگاؤ رہا۔ ان کے وطن دیسنہ کے ... پڑوسی گاؤں استھانواں کے مولوی عبد الغنی وارثی عربی کے فاضل تھے، انگریزی کی تعلیم ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں پائی، آخر میں نظام حیدرآباد کی ریاست میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ ہو گئے تھے، مگر اپنے علمی ذوق کی بناء پر وہاں علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا عبد الحلیم شررؔ اور عزیز مرزا کی علمی بزم میں شریک رہتے، ان کو ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت پیدا ہو گئی تھی، ہندی قصہ یوذاسف بلوہر کا ترجمہ اردو میں کیا، پھر عربی میں، اخلاق پر ہندو شاہ کی الکلم الروحانیہ فی الحکم الیونانیہ کو بھی اپنی زبان میں منتقل کیا۔ الف لیلہ ابن رشد اور کی سیرۃ، اسٹینلی لین پول کی مورس ان اسپین کے ترجمے بھی اردو میں کئے۔

سید صاحبؒ نے یہ چند سطریں ان کے لئے جو لکھی ہیں، وہی ان کی علمی سرگرمیوں کا حاصل ہے، ان کے دو بیٹے اچھے عہدوں پر مامور رہے، لیکن وہ اپنے مرحوم والد بزرگوار کی علمی حیثیت سے بیگانہ رہے۔

بہاریوں کو کوئی جوہرِ قابل مل جاتا تو اپنی تربیت میں لے لیتے، ان ہی میں مولوی ابو الحسنات ندوی تھے، اشرف پور ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، انھوں نے ندوہ کی تعلیم ختم کی تو سید صاحبؒ نے ان کو دار المصنفین بلا لیا، یہاں رہ کر انھوں نے "ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں" لکھی، اور خلافت تحریک کے

زمانہ میں ترک اور خلافت کے نام سے ایک رسالہ بھی قلمبند کیا، ... طویل علالت کے بعد ۱۹۲۳ء میں ان کی وفات ہو گئی، تو سید صاحب بہت دلگرفتہ ہوئے، اور لکھا کہ وہ ہماری کوششوں، ندوہ اور دار المصنفین کی تعلیم و تربیت کی بہت بڑی کمائی تھے، ان کی موت نے ہماری مجلس کو وہ صدمہ پہونچایا جس کی تلافی شاید بہت دنوں تک نہ ہو سکے، ان سے ہم بڑی ... توقع رکھتے تھے،

(یادِ رفتگان ... معارف پریس اعظم گڑھ صفحہ ۵۳)

پھلواری شریف میں سید صاحبؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم پائی، پھر وہاں کی خانقاہ مجیبہ سے ان کے خاندان والوں کے بڑے روحانی تعلقات رہے، خود سید صاحبؒ وہاں کے بزرگوں کی دینی عظمت کے قائل تھے، اس لئے ۱۹۲۴ء میں جب وہاں کی خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا بدر الدینؒ کی رحلت ہوئی تو بہت دلگیر ہو کر لکھا۔

حضرت مولانا شاہ بدر الدین سجادہ نشین پھلواریؒ، اس عہد کے جنید و شبلی تھے، ان کا زہد و ورع، زہادت و اتقا، علم و عمل، صورت و سیرت اور ہر چیز نمونۂ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبہ بہار میں روشن رہی، اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہی، ان کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعۂ کتب کے سوا اور مشاغل میں کمتر صرف ہوتے تھے، ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی، ان کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا، اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا، اس

ہند میں یہی ایک ہستی تھی، جو ظاہر و باطن علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی، اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے تھے، پھلواری کا سجادہ اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا" (یادِ رفتگان۔ صفحہ ۵۲)

کیسی دُردبھری تاثیر کے ساتھ بہار کے جنید و شبلی کی سیرت کی مرقع آرائی کردی ہے، ایسی پاکیزہ تحریر لکھنے کے لئے قلم کی سیاہی کے پاکیزہ اور دل کی ہر دھڑکن کے لیے پاکیزہ ہونے کی ضرورت ہے تب ماتمی اسلوب بھی پاکیزہ ہو سکتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں مولوی نورالہدیٰ ندوی کی وفات بہت کم عمری میں ہوئی، ندوہ سے فراغت حاصل کرکے مدرسہ الٰہیات کانپور میں تکمیل کی، پھر بی۔ اے آنرز کا امتحان پاس ہوئے کلکتہ میں ایک اخبار کے اڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا، اور جب ان کی علمی زندگی کی ترقی سے توقعات کے پورے ہونے کے دن آئے تھے، تو وفات پا گئے، سید صاحبؒ نے بہت ہی ملول ہو کر لکھا ہے۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

وہ مولانا سلیمان اشرف کے اوصاف کے بڑے مداح رہے، جو بہار شریف ضلع پٹنہ کے ایک محلہ میرداد کے رہنے والے تھے، ساری عمر علی گڈھ یونیورسٹی میں دینیات کے ایک استاد کی حیثیت سے گذاری ۱۹۳۹ء میں ان کی وفات ہوئی تو سید صاحبؒ نے ان پر جانچی ماتمی تحریر لکھی، اس میں دل کھول کر ان کے محاسن و مناقب بیان کئے، کہ وہ خوش اندام

خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج، بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خودداری اور عزت نفس کا احساس تھا، ان کے یہاں امراء اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی، اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے، اور اپنے عالمانہ شان و وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر ملے، ملک کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں، وہ نہایت فیاض کشادہ دست اور سیر چشم تھے، ان کی مجلس سدا بہار تھی، خود بھی سدا بہار تھے، ان کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے، پھر بھی ان کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا، تحریر و تالیف کا بھی ذوق تھا، خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے، حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے بھی لکھے، عربی فیلالوجی پر ایک کتاب مبین کے نام سے لکھی، سید صاحب علماء کے طبقہ میں سے کسی کی جو تعریف لکھتے ہیں تو خود ان کو فخر محسوس ہونے لگتا ہے کہ انکی جماعت میں کیسے کیسے نادرۂ روزگار پیدا ہوتے رہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ سید صاحبؒ قرب مکانی، اتحاد زمانی اور شدت ہم ذوقی کے لحاظ سے مولانا سجاد (المتوفی ۱۹۴۰ء) نائب امیر شریعت بہار سے زیادہ متاثر تھے، تو صحیح ہوگا، ان کی وفات کی خبر سنی تو لکھتے ہیں۔

"دل کو یارائے ضبط نہ رہا، آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے، وہ زمین جواب مرنے والے کی خواب گاہ ہے، ابھی قلب میں یہ ہمت بھی نہیں کہ جی بھر کے ماتم کروں، اور دل کے شیون کو سپرد قلم۔

دریں آشوب غم عذرم تبہ گر تالہ زلت گیرم
جہانے راجگر خون شد ہمیں نہ سانہ می گریم

مرنا اور جینا دنیا کے روزانہ کے کاروبار ہیں، کون نہیں مرا، اور کون نہیں مرے گا، آج وہ کل ہماری باری ہے، اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی موت پر رونے والے روتے ہیں، ان کے دائمی فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک خوبی کو یاد کرکے ان کا نوحہ پڑھتے ہیں، عام حالت یہی ہے، لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، کہ ان کی خبر سن کر زبان بند ہو جاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے، اندر اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے، مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالیے، اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجیے، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا، دن بیت گئے، ہفتے گذر گئے، مہینے ختم ہو گئے، مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہو سکی، عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہوا کہ میرا قلم جو احباب کے سوگ میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ہے، اس پہلی دفعہ وہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہوا ہے، مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ سی لگ گئی، ہرچند زبان خاموش تھی، لیکن کئی دن تک سوتے جاگتے، مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی، اور خواب میں نظر آتی رہی۔ فدمع العین و یحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک لمحزونون۔ (یادِ رفتگاں۔ ص ۲۱۳)

یہ کیسی دردناک تحریر ہے، سید صاحب کے شیون و فغان کے اظہار کا یہ بھی ایک ایک طریقہ تھا، اس میں درد کے ساتھ اخلاص، تاثیر کے ساتھ حقیقت اور تڑپ کے ساتھ اصلیت بھی ہے، وہ درد آشنا دل ہی کچھ ایسا رکھتے تھے، کہ بے تاب اور مضطرب ہو کر

تڑپ جاتے تھے، وہ جب مولانا ابوالمحاسن سجاد کے محاسن لکھنے لگے تو ان کی ایک ایک خوبی ان کو یاد آئی، اور اس کو اس طرح سمیٹ کر قلمبند کیا ہے کہ ان کی یہ ماتمی تحریر اپنے بیان کے لحاظ سے شاہکار بن گئی ہے، ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ، خاموشی میں گویائی، حال میں قال، قال میں سراپا حال، قوت عمل، ذوقِ سیاست، معاملہ فہمی، حاضر علمی، بے نیازی، استغنا، عسرت بھری زندگی کے باوجود مسلمانوں کی سلامتی و تنظیم کی دھن اور بے پناہ اخلاص کی تصویر کھینچنے کے ساتھ لکھتے ہیں کہ عقیدت کی یہ چند سطریں ان کے دیرینہ نیازمند کی طرف سے یادگار اور باقی رہیں، تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو، سید صاحب نے ان کی زندگی کا یہ دردناک واقعہ بھی لکھا ہے کہ ان کا لڑکا مرض الموت میں تھا، کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا، واپس آیا تو بیٹا دم توڑ رہا تھا، پوری تحریر میں یہی سوگوارانہ فضا قائم ہے۔

مولانا حاجی معین الدین سید صاحب سے دس برس چھوٹے تھے، ندوہ سے فارغ ہو کر بتیس سال کی عمر میں دار المصنفین آگئے، اور یہ معلوم کر کے انتہائی تعجب ہوگا کہ یہاں ایک دو سال کے قیام میں دار المصنفین کے لیے دو کتابیں، خلفائے راشدین اور مہاجرین حصہ اول لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں، ایک سال کے بعد یہاں سے چلے گئے، مختلف جگہوں کی ملازمت کے بعد آخر میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل ہو گئے تھے، اور اسی عہدہ پر تھے کہ پچاس سال کی عمر میں وفات پا گئے، ان کا وطن سید صاحب کے وطن دیسنہ کے قریب گیلانی اور استھانواں تھا، ان کی وفات پر ان کا ماتم یہ لکھ کر کیا کہ خاموش طبیعت، ملنسار، متواضع، نیک دل مجموعۂ فضل و کمال و اخلاق تھے۔

بنگال کے علمائے یو۔ پی اور بہار کے علماء کے ساتھ بنگال کے علماء کی طرف بھی ان کی

نظر اٹھی رہی، کلکتہ کے شمس العلماء حافظ نذیر احمد (المتوفی ۱۹۳۷ء) کی وہ عزت اس لئے کرتے کہ ان کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ کے نوادر الگ جواہرات سے ان کو واقفیت تھی، عجائب خانہ کلکتہ کے آثار قدیمہ کی تحقیق کا کام بھی ان کے سپرد تھا، ان کی وفات پر لکھا کہ وہ بنگال کے ان چند ممتاز علماء میں تھے، جن پر اس صوبہ کو ناز تھا۔

ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن (المتوفی ۱۹۴۷ء) سے سید صاحبؒ کو انس اس لئے رہا کہ وہ مولانا شبلیؒ کے دوستوں میں تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے شاگرد اور عاشق رہے، کانپور میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طب حکیم عبدالمجید دہلوی سے پڑھی، فطرت کے خزانے سے وہ ایک ذہین اور لطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے، اپنے اس فکری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں، اس سلسلہ سے مولانا شبلیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، ڈھاکہ سے المشرق نام کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور پھر جادو کے نام سے ایک ادبی اور علمی رسالہ بھی جاری کیا، ان کے قلم میں بڑی لطافت تھی، سید صاحبؒ ان کی طرف اس لئے بھی مائل ہوئے کہ مولانا محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے تھوڑی بہت ہو سکی، تو وہ حکیم صاحب ہی تھے، ان کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا، سکوں کے جمع کرنے کا بھی شوق رہا، حاذق طبیب بھی تھے، صورت دیکھ کر اور حال سن کر مرض بتا دیتے تھے، سید صاحبؒ نے ایک بار لکھنؤ ریڈیو پر تقریر کی ڈھاکہ میں حکیم صاحب نے ان کی آواز سنی، تو لکھ بھیجا کہ ان کی آواز ضعف قلب کا اعلان کر رہی تھی، اس کی جلد خبر لیں، اور واقعی اس کے بعد ان پر قلب کا حملہ ہوا، ان کی وفات پر انھوں نے ان کا ماتم اس طرح کیا۔

"اے حبیب! دوستوں نے تمہارے لئے مرثیے لکھے، احباب نے تمہارے فراق میں آہ جگر سوز کھینچی، جاننے والوں نے تمہارے اوصاف گنائے، ماننے والوں نے

تمہارے احسانات یاد کیے، مگر تم اس دنیا میں ہو جہاں اس دنیا کی مدح و ستائش کی صدائیں نہیں پہونچتیں، مغفرت کی دعائیں تمہارے لئے ہیں، غفور رحیم ان کو قبول فرمائے۔

سید صاحب کی ماتم گساری کا یہ انداز بیان بھی تھا جس میں کیسا درد بھرا ہوا ہے۔

مولانا ابو البرکات عبدالرؤف دانا پوری (المتوفی ۱۹۴۸ء) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، صوبہ بہار کے قصبہ دانا پور ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، مگر کلکتہ میں جاکر سکونت پذیر ہو گئے تھے، سید صاحب نے نکاح و طلاق کے مسئلہ پر ان کی ایک تحریر کا رد بھی کیا، مگر پھر سیاسی جلسوں میں ان کا ساتھ رہا، تو ان کی عزت کرنے لگے، ان کی وفات پر ان سے اپنی عقیدت کا اظہار یہ لکھ کر کیا کہ وہ زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات و افکار سے پوری طرح آگاہ تھے، اور ان علماء میں تھے، جو قدیم علوم و اعتقادات فقہ کو جدید خیالات و افکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں، پھر یہ بھی لکھا کہ وہ ایک ممتاز طبیب، ایک مشہور عالم، ایک خوش بیان خطیب اور ایک مفکر ہونے کے ساتھ مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب اصح السیر ہے، جو افسوس ہے کہ ان کی وفات سے ناتمام رہی۔

ٹونک کے علماء ٹونک کے علماء سے بھی سید صاحبؒ کی راہ و رسم رہی مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (المتوفی ۱۹۳۰ء) لاہور کے اورینٹل کالج میں رہنے کے بعد دارالعلوم ندوہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، اس لئے ان کی لیاقت و قابلیت سے براہ راست واقفیت تھی، وہ ندوہ سے مدرسہ عالیہ کلکتہ چلے گئے تھے، وہاں بیمار ہوئے تو اپنے لڑکے مفتی انوار الحق ناظم و مشیر تعلیمات بھوپال کے پاس چلے گئے، اور وہیں وفات پائی، لاہور میں انجمن مستشار العلماء سے بھی وابستہ رہے، عربی کی درسی کتابوں پر حواشی بھی لکھے تھے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے لکھا کہ مرحوم عربی درسگاہوں کی

قدیم تعلیم کے بہترین نمونہ تھے، ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ان کا شمار تھا۔

سید صاحب کو مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی (المتوفی سنہ ۱۹۲۸ء) سے اس لئے جذباتی لگاؤ رہا کہ وہ ضلع پٹنہ ہی کے رہنے والے تھے، تعلیم پاکر ٹونک گئے، تو وہیں سکونت پذیر ہو گئے والی ٹونک نے ان کی پوری قدردانی کی، اور ان کو اپنی ریاست کا فخر سمجھتے تھے، سید صاحب ان کی قدر، تصوف میں ان کی کتاب انہار اربعہ، فلسفہ میں القول الضابط فی تحقیق الوجود الرابطی اور امام الکلام فی تحقیق الاجسام کلام میں بر حاشیہ شرح مواقف حدیث میں حاشیہ بر جامع ترمذی کی وجہ سے کرتے، ان کی وفات پر اپنے غمگین جذبات کا اظہار اس طرح کیا کہ مرحوم نہ صرف اپنے علم و فضل میں بلکہ اپنے محاسن اخلاق میں بھی پرانے بزرگوں کی شان رکھتے تھے، کتب بینی کا یہ عالم تھا، کہ وہ رات بھی جس میں ان کی وفات ہوئی مطالعہ سے ناغہ نہ گئی، نوجوان دنیا ان بوڑھے بزرگوں کی نظیر و مثال پیدا نہ کر سکے گی۔

مفتی محمد انوار الحق ٹونکی المتوفی سنہ ۱۹۴۰ء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کے لڑکے تھے، بھوپال میں وزیر تعلیم اور وزیر بھوپال رہے، ان کی وفات پر سید صاحب نے لکھا کہ صاحب علم اور محب دین تھے، ان کی علمی خدمات، تحریری مجاہدات بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، ان کی تاریخ ابو البشر، اثبات واجب الوجود اور دوسری مذہبی کتابیں تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں۔

مولانا محمد سورتی المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سورت کے رہنے والے تھے، مگر ان کی شادی ٹونک میں ہوئی، بڑے لائق اور فاضل عالم تھے، مگر اپنے درشت مزاج کی وجہ سے کہیں ایک جگہ مستقل طریقہ سے نہیں رہے، جامعہ ملیہ میں معلم تھے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ چلے آئے پھر بمبئی کے ایک اہل حدیث کے مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے، ان کو قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا، ان کی تلاش میں پٹنہ، رامپور، کلکتہ اور حیدرآباد کا

سفر کیا کرتے تھے، وفات علی گڑھ میں ہوئی، بڑے غالی قسم کے اہل حدیث تھے، پھر سید صاحب ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کے بڑے قدردان رہے، اسی لیے ان کی وفات پر یہ لکھ کر ماتم کیا کہ اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظہ کے صاحب علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہے، اس وقت اتنا وسیع النظر اور وسیع المطالعہ کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو، لغت، ادب، اخبار، انساب اور رجال کے اس زمانہ میں در حقیقت وہ امام تھے، اس عہد میں ان کی نظیر نہیں، جو کتاب دیکھتے تھے، وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی، سینکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار و انساب نوک زبان تھے، ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء، ادباء اور محدثین کی وسعت حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں یقیناً صحیح ہیں"، ایک عالم یا ایک مصنف اپنے معاصر عالم اور مصنف کی مدح و ستائش میں ایسی فراخدلی کم دکھاتا ہے، جو سید صاحب نے اپنی مذکورہ بالا تحریر میں دکھائی ہے،

مولانا حیدر حسن ٹونکی متوفی جولائی سنہ ۱۹۴۲ء تقریباً پندرہ سال تک دار العلوم ندوہ میں شیخ الحدیث رہے، اس لیے سید صاحب ان سے اور وہ ان سے بہت قریب رہے اس لیے ان کے علم و فضل سے اچھی طرح واقف ہوئے، ان سے برابر علمی گفتگو بھی کی، اور ان کی قابلیت اور صلاحیت کے قائل ہوئے، ان کا علمی خاندان بھی علم و فن کا قدردان تھا، ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں تھے، جن کی معجم المصنفین بڑی مقبول ہوئی، مولانا حیدر حسن خان کی وفات پر سید صاحب نے یہ لکھا کہ مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ اور نقلیہ کے وہ یکساں ماہر تھے، اپنے علم و فضل کے باوجود بے حد منکسر المزاج خاکسار بے حد متواضع، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں ممتاز تھے، ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون

طمانیت کی تصویر ہوتی تھی، لکھنو کے اکثر اہلِ علم ان کے معترف اور مداح رہے، اور مسائل میں ان کا فیصلہ قولِ فیصل کا حکم رکھتا تھا۔

خطۂ پنجاب کے علماء | مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری المتوفی سنہ ۱۹۳۰ء پٹیالہ میں جج رہے، ندوۃ العلماء کے دیرینہ رکن تھے، اسی واسطے سے سید صاحبؒ سے تعلقات پیدا ہوئے، جب دونوں ملتے تو سیرۃ، جدید مناظرات، کلام اور محاسنِ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر ایسی گفتگو رہتی کہ بقول سید صاحبؒ اس لطف میں تھوڑی دیر کے لیے ہر چیز کو بھول جاتے، اسی محبت میں وہ دار المصنفین بھی آئے، ایک بار حج کر چکے تھے، دوسری بار حج کے لیے گئے تو واپسی میں جہاز ہی پر وفات پائی، جس کے بعد سید صاحبؒ نے ان پر بہت ہی غمناک تحریر لکھی کہ وہ علم و عمل، زہد و کمال، اور فضل و ورع کے جامع تھے، روشن دل اور روشن دماغ دونوں تھے، ان کے جدید و قدیم دونوں خیالات حدِ اعتدال پر رہے، عربی زبان اور علوم دین کے مبصر عالم تھے، توریت و انجیل پر ان کی فاضلانہ اور ناقدانہ نگاہ تھی، غیر مسلموں سے برابر مناظرہ کرتے، مگر ان کے مناظرہ کا طرز سنجیدگی، متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ تھا، مسلکاً اہلِ حدیث تھے، مگر اماموں اور مجتہدوں کی عزت دل سے کرتے، ان کی مستقل تصنیفات میں رحمۃ للعالمین، الجمال والکمال، تفسیر سورۂ یوسف اور سفرنامہ حجاز یادگار ہیں، چھوٹے بڑے بیسیوں رسائل بھی لکھے، لیکن سب سے زیادہ مقبولیت رحمۃ للعالمین کو حاصل ہوئی، مدرسوں میں داخل کی گئی، لوگوں نے ذوق و شوق سے اسکو پڑھا، خدا رحمۃ للعالمین کے مصنف کو اپنی رحمتِ عالم سے نوازے۔

اس تحریر سے بھی سید صاحب کی علمی فراخدلی کا اظہار ہوتا ہے۔

وہ شملہ کے مولوی غلام محمد المتوفی سنہ ۱۹۳۳ء کے اس لئے معترف تھے کہ جوانی میں

وہ تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں رہا کرتے، مگر ندوۃ العلماء کی تحریک سے ایسے متاثر ہوئے کہ دوبارہ دنیا میں داخل ہوئے، اور اس کے لئے ہندوستان کی گلی گلی کی خاک چھانی، ان کی وفات پر سید صاحب نے لکھا کہ وہ بڑے پُرجوش مقرر، روشن خیال عالم اور صاحبِ عزم محنتی تھے، ستر برس کی عمر میں بھی، ان کی محنت جوانوں کو شرماتی تھی۔

مولانا عبد القادر قصوری المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء سید صاحبؒ کے ساتھ خلافت کی تحریک اور وفد حجاز میں ساتھ رہے، ان ہی کے ساتھ مکلا، سوڈان، جدہ اور قاہرہ کا سفر کیا، ان کے مشوروں کے بے حد قائل تھے، وہ مسلکاً اہلِ حدیث تھے، مگر سید صاحب ان کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ان کے بڑے قدردان رہے، ان کی وفات ہوئی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا، اور اسی حال میں لکھا کہ، قصور ضلع لاہور ان کا وطن تھا، وہیں وکالت کرتے تھے، مگر عربی کے عالم، دینیات کے بھی فاضل تھے، مولانا ابو الکلام آزاد کے الہلال والی تحریک سے ان کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لیے انھوں نے بہت کچھ نثار کیا، نہایت وضعدار، متواضع ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شایق تھے، ان ہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا،

مولانا ثناء اللہ امرتسری، المتوفی ۱۹۴۸ء بڑے غالی قسم کے اہلِ حدیث تھے، گو سید صاحب سے ان کے برابر خوشگوار تعلقات رہے، وہ ندوہ کے بھی اکثر رکن ہوئے۔ تحریک خلافت جمعیۃ العلماء کے بعض اجلاسوں، وفد حجاز اور حج کے سفر میں بھی ان کا ساتھ رہا، ان کے حقیقی حریف مولانا عبد العزیز خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری تھے، دونوں کے تحریری مناظرہ میں، سید صاحبؒ نے مولانا عبد العزیز کا ساتھ دیا، اور پھر وہ برابر ... مولانا ثناء اللہ کو لکھتے رہے کہ وہ آمین، اور رفع یدین وغیرہ پر وقت نہ ضائع کیا کریں

مگر اس کے باوجود آخر وقت تک دونوں کی راہ و رسم میں خوشگواری رہی، لاہور کے ایک سفر میں امرت سر جاکر ان کے پاس دو دن قیام بھی کیا، اور جب ان کی وفات ہوئی تو لکھا کہ مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور علم سے، اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا، اسی کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھا، وہ وہی ہوتے، اللہ تعالے اس غازی اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے۔

اجمیر کے عالم | اجمیر کے عالم مولانا معین الدین اجمیری المتوفی محرم ۱۳۵۹ھ سے بہت متاثر تھی اسی لیے خلاف معمول ان پر بڑی لمبی تحریر لکھی، اس لئے کہ ان کو ذات نبوی سے بڑا عشق رہا، اور ان کے استغنا رجوع الی اللہ اور توکل کی وجہ سے اجمیر میں ان کی بڑی مقبولیت تھی، ان کی والدہ دانا پور ضلع پٹنہ کے ایک نو مسلم خاندان سے تھیں، ان کا خاندان بھی نو مسلم راجپوت تھا، ان کے والد طبیب الدین دانم پردیش کے رہنے والے تھے، ریاست ٹونک میں وہاں کے سکریٹری ہوگئے تھے، مولانا معین الدین اجمیری کی پیدائش دیولی (راجپوتانہ) میں ہوئی، انھوں نے تعلیم مولانا برکات احمد ٹونکی سے پائی، ریاضی کی تعلیم مولانا لطف اللہ سے حاصل کی، تعلیم پانے کے بعد بڑے اچھے مناظر ہوئے، آریوں اور رامپور میں مولانا عبد الوہاب فلسفی سے مناظرے کر کے اپنی قابلیت کی دھاک جما دی تھی، لاہور کے مدرسہ نعمانیہ میں صدر مدرس ہوئے، پھر اجمیر میں سکونت اختیار کرلی، وہاں نظام حیدرآباد کی مالی امداد سے ایک مدرسہ معینیہ عثمانیہ قائم کیا، وہاں اختلاف ہوا تو دوسرا مدرسہ دار العلوم حنفیہ صوفیہ قائم کیا، یہاں بھی اختلاف ہوا تو اس سے الگ ہوگئے، مگر ان کے درس و تدریس کی بڑی دھوم رہی، ہندستان کے علاوہ بلخ، بخارا، حبش اور افغانستان سے بھی طلبہ آکر ان سے درس لیتے، انھوں نے تحریک خلافت میں بھی پورا حصہ لیا، اور قید و بند کی مشقت جھیلی، ان کے فتاوی کی بڑی دھوم رہی، حرمین کے علماء بھی ان کی تائید کرتے، سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی ان کی توجہ تھی، فرنگی محل کے مولانا شاہ عبد الوہاب سے بیعت تھے۔ (باقی)

مولانا محمد علی[1]

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی دہلی،

سب سے پہلے تو میں آپ کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مولانا محمد علی کے نام سے یہ بزم آراستہ کی اور اس ناچیز کو اس جلسہ کی صدارت کا شرف عطا فرمایا، اس عزت افزائی کے لئے الفاظ ناکافی ہیں، جذبات کی شدت مجھ سے صرف خاموشی کا مطالبہ کرتی ہے، اور دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالے اس یاد کے طفیل میں مجھے اور آپ کو مولانا محمد علی کے قلب کی گرمی مرحمت فرمائے۔ ؎

کفر، کافر را و دیں دیندار را … ذرۂ دردِ دل عطار را

یہی دعا میں نے ۱۹۵۶ء میں بیت المقدس میں مولانا محمد علی کے مزار پر مانگی تھی، میں جب کلکتہ آرہا تھا جو غالب، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی کا عزیز شہر ہے، تو ایک دوست نے جو تاریخ کے پروفیسر ہیں پوچھا، محمد علی پر سیمنار کے کیا معنی؟ آج ان کی کیا Relevance اور معنویت ہے؟ میں نے ان سے عرض کیا تھا، ایک عاشق صادق نے اس کا جواب اس طرح دیا تھا۔ ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن … پروانہ ز من، شمع ز من، گل ز من آموخت

---

[1] یہ مقالہ کلکتہ کی مولانا محمد علی لائبریری کے اس سیمنار میں پڑھا گیا، جو فروری ۱۹۶۶ء میں ہوا تھا۔

یعنی پروانہ نے جلنا، شمع نے تابانی و درخشانی اور پھول نے اپنا دامن چاک کرنا، یہ سب اسی عاشقِ صادق سے سیکھا ہے۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن
پروانہ ز من، شمع ز من، گل ز من آموخت

میرے یہ معروضات اسی نقطۂ نظر کی تشریح اور توضیح ہیں۔

عجیب لطیفہ ہے کہ چند مہینے پہلے آکسفورڈ میں St. Antonys College کے ایک طالب علم نے مجھ سے پوچھا تھا، کیا آپ مولانا محمد علی کو پسند کرتے ہیں، میں نے عرض کیا تھا۔ I do not like him; I love him. اس محبت اور شیفتگی کے باوجود میں اُن پر تنقید کو جائز سمجھتا ہوں اور ان کو مستقبل کی کڑی دھوپ میں جانچنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اس تنقید سے میری عقیدت اور ارادت میں کمی نہیں آئی، شیکسپیر کے الفاظ میں With all thy faults, love thee still ہے۔

مجھے اس کا فرار واقعی افسوس ہے کہ ہماری موجودہ تاریخوں میں مولانا محمد علی کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

یہ نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ بدترین ناسپاسی اور حق ناشناسی ہے، ہمارے سماج کا فرض ہے کہ وہ تعلیم میں خاص طور پر اُن امور کا خیال رکھے جن سے ہماری مشترکہ تہذیب کا تانا بانا تیار ہوا ہے، وہ کثرت میں وحدت کو تلاش کرے، اور لالہ و گل و نسرین سب ہی رنگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ دے، گذرے ہوئے زمانے کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچائے اور تعلیم کی بنیاد، اپنے تمدن پر استوار کرے، ہماری تاریخ صرف کتابوں میں لکھے رہنے

سے یا ایک ممیمو نیم سیمینار کے انعقاد سے زندہ نہیں رہ سکتی، اس کی زندگی کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ سماج کے دل و دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو۔

یہ نیا سماج جو بن رہا ہے، اگر اس میں مولانا محمد علی کے قلب کی گرمی اور روح کی بیتابی، مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن کی جودت اور بصیرت، رفیع احمد قدوائی کی شیفتگی اور فراخ دلی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرزانگی اور دیدہ وری شامل نہ ہوئی تو تمدن کتنا بے رنگ اور بے روح ہوگا۔ اور یہ نقصان صرف مسلمانوں ہی کا نہیں پورے ہندوستانی سماج اور پورے ملک کا ہوگا۔

اس خطبہ کا مقصد نہ مولانا محمد علی کی زندگی بیان کرنا ہے، اور نہ خلافت کی تحریک کی روداد پیش کرنا ہے، بلکہ اس کا مقصد مولانا محمد علی کے کام کی قدر و قیمت ہندوستان کے بڑے نقشے میں متعین کرنا ہے، اور اس طرح خلافت کی تحریک کو ہندوستان کے برتر مفاد سے ہم آہنگ کر کے اس کی اہمیت اور معنویت کو جانچنا ہے، اس کا مقصد ہم کلامی ہے، اور اپنے خیالات اور شبہات میں آپ کو شریک کرنا ہے، اور یہ سب از روئے استعداد نہیں، بلکہ کسبِ شرف کے طور پر ہے۔

مولانا محمد علی کے انتقال پر ایچ۔ جی۔ ویلز نے جو انگلستان کا بڑا ادیب اور مورخ تھا لکھا تھا، محمد علی کا دل نپولین کا تھا، قلم میکالے کا تھا اور زبان یا خطابت برک کی سی تھی، یہ بات صحیح ہے، ان میں اور نپولین میں بہت مشابہت تھی، نپولین بھی ناکام رہا، اور محمد علی بھی ناکام رہے، لیکن نپولین کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ماسکو تک پہنچا تو — ۲۹ minus ٹمپریچر میں، جب تمام روس برف کی موٹی چادروں سے ڈھکا ہوا تھا، مولانا محمد علی کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد

پہلی سب سے بڑی عوامی تحریک کی قیادت کی جس میں انھوں نے ایک کروڑ والنٹیر دیئے، اپنی شعلہ بیانی سے تمام ملک میں آگ لگادی، سرفروشوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کردی۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے وہ نظارے پیش کیے جو چشم فلک نے آج تک نہیں دیکھے تھے، اور جن کو دیکھ کر حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند، انھوں نے اس تحریک کے ذریعے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان اسی وقت ترقی کے راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے، جب یہ دو بڑے گروہ ہندو اور مسلمان باہم متحد ہو جائیں، اور ان میں فاصلہ باقی نہ رہے، یہی وہ پالیسی ہے جو کانگریس کی امتیازی شان رکن رکین بنی، اور جس کی خاطر مہاتما گاندھی نے اپنی جان دی، مانا کہ مولانا محمد علی نے جذبات اور تخیل کی مدد سے مابعد کے بلبلے بھی بنائے، جو خلافت کی تنسیخ کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو گئے، لیکن کون سی تحریک ہے، جو بغیر جذبات کی گرمی کے فروغ پا سکتی ہے؟

مولانا محمد علی پر تنقید کرتے وقت ہمیں ان کے ماحول، ان کے مزاج اور ان کی مجبوریوں پر ضرور غور کرنا چاہیے، ان کا تو یہ حال تھا کہ ذیابیطس کی سخت تکلیف تھی، بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا تھا، اور آشوب چشم کی وجہ سے آنکھ نہیں کھلتی تھی، ان کی عزیز بیٹی آمنہ سخت بیمار تھیں، اب دم اب دم ہو رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ پیسے مطلق پاس نہیں تھے، اس وقت یہ ضروری تھا کہ ایک عرض داشت وائسرائے بہادر کو پیش کی جائے۔ ناچار اس بیماری اور بخار کے عالم میں خود عرضداشت کا مسودہ تیار کیا، خود بہت پرانے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا اور خود کنتی سواری کے تانگہ میں بیٹھ کر وائسرائے کے منڑی سکریٹری کو جا کر عرضی دے آتے۔

جو باتیں آج ہمیں غیر حقیقی اور تخیلی معلوم ہوتی ہیں، وہ مولانا محمد علی کی نظر میں حقیقت بسیط تھیں۔ اور وہ ان پر اس طرح سہارا لیے ہوئے تھے، جیسے ایک کمزور آدمی لکڑی پر سہارا لیتا ہے، ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا، کہ میں سنت ابراہیمی پر عمل کر کے،

خلافت کے راستہ میں اپنے آپ کو، اپنی بیٹیوں کو اپنی بوڑھی ماں کو قربان کرنا چاہتا ہوں"، یہ الفاظ اتنی شدت، اور اتنے جوش میں کہے گئے تھے کہ تمام مجمع رونے لگا تھا، اور اگلی صف کے لوگوں نے اٹھ کر کہا تھا "نہیں خدا کی قسم، سب سے پہلے ہم یہ قربانی پیش کریں گے" یہ سچا ڈرامہ اس وقت کھیلا جا رہا تھا، جب خلافت لوح جہاں سے حرف غلط کی طرح مٹ چکی تھی اور ترکی میں لا مذہبی ری پبلک قائم ہو چکی تھی، میں اس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو چیز غیر حقیقی تھی، وہی مولانا کی نظر میں، حقیقت بن گئی تھی وہ بار بار عرفی کا یہ شعر پڑھتے تھے، ؎

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
دور زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

وہ واقعی شہید ہونا چاہتے تھے، اور یہ آرزو ان کے دل کی آرزو تھی، اور یہ آدازان کے ہر بن مو کی آرزو تھی، مولانا محمد علی کی خطابت اور عوام کے جوش و خروش کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین مجلس، لباس فاخرہ پہن کر جمع تو ہو گئے ہیں، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کدھر جائیں، اور کیا کریں، خلافت کی تنسیخ کے بعد ان کا جذباتی سہارا ختم ہو گیا۔ اور اس بدبخت اور حق ناشناس قوم نے الزامات کی بوچھار کر کے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا، ان کو ٹوڈی کہا گیا، اور ان کی تحریک کو یہ بتایا گیا کہ اس کا کوئی تعلق ہندوستان کی حب الوطنی سے نہیں تھا اور یہ صرف ملائیت کی زائیدہ تھی۔

ان غلط اور بے بنیاد الزامات کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد علی اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھے، واقعی دیوپیکر اور جامع صفات جنھیں قدرت نے ذہن بیدار کے ساتھ ساتھ قلب اور روح کی بے تابی بھی عنایت فرمائی تھی، انھوں نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے۔ اور بہت سے شیشہ گروں کی دوکانیں درہم برہم کر دیں، انھوں نے بہت سے سہارے چھوڑ کر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا، اور

یہ بتلایا کہ کوئی تحریک بغیر دل کی بیتابی اور بغیر عوام کی شرکت کے کامیاب نہیں ہو سکتی، اور اسی طرح بغیر ملکی آزادی کے ہماری بین الاقوامی ساکھ بھی قائم نہیں ہو سکتی، مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے خلاف جو شور انگیز آواز بلند کی اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہم کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے، انھوں نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس راستہ کے نشیب فراز اس وقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک ہم احساس کی شدت کے ساتھ لیلائے آزادی سے محبت نہ کریں اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کریں، عراقی کے الفاظ میں۔ ؎

بعالم ہر کجا درد و محن است | بہم کردند و عشقش نام کردند

عشق کے اس راستے میں انھوں نے بہت سی صعوبتیں اٹھائیں، بڑی بڑی کڑیاں جھیلیں لیکن برطانیہ کے خلاف جس کے اقتدار کا پرچم تا حدِ نظر لہرا رہا تھا، انھوں نے دار و رسن اور قید و بند کی ہر منزل کو . . . غزل خوانی کے ساتھ طے کیا حتیٰ کہ ان کی زندگی اور پھر موت خود غزل بن گئی، ذیل کی غزل ان کی روحانی زندگی کی آئینہ دار ہے، اور اسیری و نظر بندی کی "لطافتوں" کو پیش کرتی ہے۔

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں | اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں،
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے | ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں | ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت | اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں | بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اور اُن کی موت پر تو خود زندگی کو رشک آیا ہوگا، بیت المقدس میں اقبال کے ان اشعار کو پڑھکر جو مولانا محمد علی کی وفات پر لکھے گئے تھے، میرے دل کی جو کیفیت ہوئی

وہ بیان سے باہر ہے۔ ؎

اے خوشا مشتِ غبارِ اُو کہ در جذبِ حرم | از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گذشت
خاکِ قدس اُو را بہ آغوشِ تمنا در گرفت | سوئے گردوں زان رفت راہے کہ پیغمبر گذشت

مولانا محمد علی "عقیدوں کا وفاق" چاہتے تھے، اور ان کا مقصد خود اُن ہی کے الفاظ میں "ہندوستانی مسلمانوں کو کیتھولک عیسائیوں کی طرح ایک طرف اپنی قومی ریاست کا وفادار شہری بنانا اور دوسری طرف ویٹی گن کی طرح ایک بین الاقوامی مذہبی تنظیم کا وفادار رکن بنانا تھا"

مولانا محمد علی کے لیے اسلامی ملکوں کی اور خصوصاً ترکوں کی حمایت کو محض جذبات کا معاملہ نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ وہ عام مسلمانوں کے لیے تھا، اُن کا یہ سوچا سمجھا ہوا نظریہ تھا کہ اسلام کی بقاء کے لیئے ترکی خلافت کو قائم رکھنا اور ایک موثر عالمگیر مذہبی تنظیم بنانا ازبس ضروری ہے۔ بدقسمتی سے یہ نظریہ اسلامی ملکوں کے اندرونی حالات غیر حقیقت پسندانہ معلومات اور نادرست تشخیص پر مبنی تھا، مولانا محمد علی کے اخبار "کامریڈ" کے نمائندوں کے ذرائع معلومات بہت محدود اور ناقص تھے، اور انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ عام طور پر اسلامی ملکوں میں جو سلطنتِ ترکی کے ماتحت ہیں، ان کے ہم خیال بہت کم ہیں، اور ان کو مجبور و محکوم ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بھی غضب تھا، کہ ترکی کی خلافت ختم ہونے کے بعد بھی یہ مہم اسی شد و مد سے جاری رہی۔

تاہم ان مقاصد کے لیئے مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے مظالم کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا اور جس طرح آزادی کی تحریک کو عوام کے اتحاد اور جوش عمل میں تبدیل کر دیا وہ ہماری تحریک آزادی کا زریں ورق ہے۔

مولانا محمد علی کے سامنے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی صاف

اور واضح نقشہ نہیں تھا، ہندوستان ایک برصغیر ہے، اس کا رقبہ روس کو چھوڑ کر پورے یورپ
کے برابر ہے، اس کے مسائل بڑے پیچیدہ اور نازک ہیں، ان امور کو لمبی لمبی شرر فشاں تقریروں
اور طول طویل خطبوں اور تحریروں سے طے نہیں کیا جا سکتا، چاہے وہ تحریریں اور تقریریں
کتنی اچھی، اور دلکش انگریزی میں کیوں نہ ہوں، مولانا محمد علی کا وہ خطبہ جو انھوں نے کوکناڈا
میں بہ حیثیت کانگریس کے صدر کے دیا تھا، کانگریس کی پوری تاریخ میں سب سے لمبا
خطبہ ہے، اور پورے ساڑھے چار گھنٹہ میں ختم ہوا تھا، اس میں بھی کام جوش زیادہ ہے
اور ہوش کی آواز مدھم ہے، انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ بیک وقت "مسلمان"
اور "ہندوستانی" ہونا ممکن ہے، لیکن کس طرح کا مسلمان ہوتا؟ مولانا عبد الباری کی قسم کا؟
مولانا محمود الحسن کے انداز کا؟ یا جناح صاحب کی طرز و روش کا؟ اس کی طرف اشارہ
نہیں کیا، خطبہ میں وہی جوش و خروش، وہی انتہا پسندی، وہی صحافی کا سا عاجلانہ انداز، وہی
اضطراب کی فراوانی اور بصیرت کی کمی، وہی خواب و خیال کی غیر حقیقی فضا ہے، جو ان کی زندگی
اور شخصیت میں ملتی ہے، اس میں فکر کی گہرائی اور جاوداں بن جانے والا جذبہ نہیں ہے،[1]

یہاں اس کے اعادہ میں مضائقہ نہیں کہ ترکی کی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں خلیفہ محمد ششم
کو معزول کر کے سلطان عبد المجید کو مسند خلافت پر بٹھا دیا تھا، اور اس کے اختیارات صرف
روحانی دنیا تک محدود ہو گئے تھے، ٹھیک اس وقت جب مولانا محمد علی اپنا خطبہ پڑھ رہے تھے،
ترکی اسمبلی نے خلافت کو ختم کر دیا تھا، اور سلطان عبد المجید اور ان کے اہل کو سوئٹزرلینڈ
میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا، اس طرح مولانا محمد علی کی طلاقت لسانی، بے محل، اور ان کا جوش
و خروش بے بنیاد تھا، اور اس غبارہ میں پہلے ہی چھید ہو چکا تھا، یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ

[1] معارف: شاید ہمارے بعض ناظرین کو اس سے اتفاق نہ ہو۔

مسلمان قوم کے آیندہ رہنما یعنی علامہ اقبال اور محمد علی جناح نے خلافت کے اختتام پر ایک
آنسو بھی نہیں گرایا، لیکن مولانا محمد علی کی ساری کائنات لٹ گئی، اور ان کے چاروں طرف
اندھیرا چھا گیا۔

خلافت کے دوران جو ہندو مسلم اتحاد پیدا ہوا تھا، اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال
ہے کہ وہ مصنوعی اور غیر حقیقی تھا، اس زمانہ میں جو فسادات برپا ہوئے، یا جو فسادات انگریزوں
نے کرائے ان میں خاص طور پر قابل ذکر مالیگاؤں اور علی گڑھ کے بلوے ہیں جو ۱۹۲۱ء
میں ہوئے، اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں سہارنپور کا ہولناک فساد ہوا، موپلوں کی بغاوت کی اقتصادی
بنیاد تھی، لیکن انھوں نے اپنا علحدہ خلیفہ چن لیا تھا۔ اور ہندو زمینداروں پر پے در پے
حملے شروع کر دیے تھے۔

مولانا محمد علی نے اپنی کوکناڈا کی تقریر میں ہندو مسلم اختلافات، تنسیخ تقسیم بنگال، مسجد کانپور،
شدھی اور سنگھٹن، غرض تمام عصری مسائل کا احاطہ کیا ہے، لیکن آج وہ کتنے غیر اہم معلوم ہوتے
ہیں، خطابت کے جوش میں انھوں نے بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں جو آج عجیب و غریب معلوم
ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ اگر افغانستان کی فوج انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہندوستان پر حملہ کرے
تو ہمیں افغانوں کی جان و مال سے مدد کرنا چاہیے، بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ امیر افغانستان کس درجہ
اور کس مسلک کا آدمی ہے، یا یہ فرمایا کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت بالکل گوارا ہے، اگر کسی طرح
خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کو پورے پورے اختیارات مل جائیں۔

تحریک خلافت کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ خود ترکی میں خلافت کا قلع قمع ہو چکا تھا
اور اس کی جگہ وہاں سیکولر حکومت قائم ہو چکی تھی، اور زمین پیروں کے نیچے سے نکل چکی تھی، پھر بھی مولانا
محمد علی اور ان کے ہمنوا خلافت پر جان دینے کے لیے تیار تھے۔

لیکن خلافت کی تحریک کا سب سے بڑا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے نیشنلزم کا صور پھونکا، اور ہمیں انگریزوں کے ساتھ وفادارانہ پالیسی سے نجات دلائی اور علمائے اسلام اور علی گڑھ کے طلبہ اور متوسط طبقہ نے دل و جان سے تحریک آزادی میں شرکت کی۔ اس تحریک نے جنگ عظیم اول کے بعد اور مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد پہلی دفعہ من حیث القوم برطانیہ کے خلاف صف آرا کر دیا۔ سرسید کی مجبوریوں اور ان کے خیالات و افکار کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی تحریک دراصل سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گنگا جمنی نیشنلزم کے درمیان ایک ضروری کڑی تھی، بغیر اس عبوری منزل کے ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتے تھے، اس لئے مولانا محمد علی کو سرسید کا مخالف سمجھنا بھی غلط ہے۔

خلافت نے علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کو تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ اور انہی کی مدد سے ایک آزاد قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم ہوئی، جس کا مقصد سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی کا آمیزہ تیار کرنا تھا۔ اور جو دراصل علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی کو ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت معلوم تھی، اور وہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے تیار تھے، بڑے بھائی مولانا شوکت علی قشقہ لگانے، دیر میں بیٹھنے اور عیدالاضحیٰ میں قربانی چھوڑنے پر آمادہ تھے، مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان میں بکری کا گوشت اتنا سستا ہوگا کہ مسلمان گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے مرض کے بجائے مرض کی علامت کو اصل مرض سمجھ لیا تھا۔

تاہم ہمیں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ تحریکِ خلافت نے نیشنلزم کو

فروغ دیا، مغرب کے خلاف صف بندی کی، آزادی کی بنیادوں کو وسیع تر کیا اور جاگیردارانہ قیادت کو ختم کر دیا، اس نے متوسط طبقہ کو جو سرسید کے علی گڑھ کا پروردہ تھا، آگے بڑھایا اور اس کے دل میں آزادی کی چنگاریاں روشن کیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے ہمیں کوئی ایسا سماجی اور اقتصادی پروگرام نہیں دیا جس سے مضبوط بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکتی، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد علی نے اسی تحریک کے زمانہ میں یہ بات پورے خلوص نیت سے کہی تھی کہ ہندوستان کے مسائل کا حل لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ اور عقیدوں اور مذہبوں کے وفاق میں پوشیدہ ہے، جو ایک بلند سطح پر پہونچکر سیاسی وفاق بن سکتا ہے، اور جس پر مولانا آزاد نے وزارتی مشن مذاکرات کے درمیان اتنا زور دیا تھا، اور جس کی تائید بہت پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کاشی ودیاپیٹھ کے جلسہ میں فرمائی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں ہیں اسی اقتباس پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور یہی میرے خیال میں اس سمپوزیم کا ماحصل ہے:۔

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ انھیں قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔"

باب التقریظ والانتقاد

پیغمبر اسلامؐ کے سیاسی مکتوبات میں سے چھ کی اصلیں [1]

مولفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۲۴۰) صفحے، کئی درجن تصویریں، نفیس طباعت۔

یہ مولف کی تازہ ترین تالیف ہے، جو فرانسیسی زبان میں ہے، اس کے متعدد ابواب سے اردو داں کافی عرصے سے واقف ہیں، مثلاً آنحضرتؐ کا خط قیصر روم کے نام (معارف جون ۱۹۳۵ء) عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات (معارف جولائی ۱۹۴۲ء) لیکن اس میں بہت سی چیزیں بالکل نئی ہیں، اور خاص اس کتاب کے لئے تالیف ہوئی ہیں۔

کتاب میں رسول اکرمؐ کے مکتوبات بنام مقوقس، النجاشی، قیصر، کسریٰ، المنذر بن ساویٰ اور جیفر و عبد (ہر دو فرزندان الجلندی) سے بحث ہے، ان کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں، اور ان کی صحت و اصلیت اور ہر ایک کے تاریخی پس منظر پہ الگ الگ بابوں میں بحث ہے بعض پر فرنگیوں نے بھی کچھ لکھا تھا، اس کی تفصیل اور تردید بھی ہے، جیفر اور عبد عمان کے مشترکہ حکمران تھے، ان کے نام کا نامۂ مبارک تازہ ترین دستیاب ہوا ہے،

لیکن شروع میں تقریباً ایک سو صفحوں کا ایک طویل مقدمہ ہے، جو عربی خط کے ارتقا کی تاریخ پر مشتمل ہے، قبل اسلام کے قدیم ترین عربی کتبے جو اب تک ملے ہیں، ان سب کے

---

[1] Six Originaux des lettres diplomatiques du Prophete de L"Islam, Paris 1985, 75 Franos

فوٹو دئے گئے ہیں، اور یہ عجیب انکشاف ہوتا ہے، کہ عربی زبان ہی کی طرح عربی خط بھی بعثت نبویؐ کے وقت اس قدر مکمل ہوگیا تھا کہ اس میں بعد ازاں عملاً کوئی ترمیم نہیں ہوئی، حتیٰ کہ حروف پر نقطوں کا بھی عہد نبویؐ سے ذکر ملتا ہے، (صفحہ ۴۵ ومابعد) جرمن مستشرق رٹر کہتا ہے، کہ "عربی خط دنیا کے سارے خطوں کی ملکہ ہے"۔

اس سے کتنوں کو واقفیت ہوگی کہ طباعت کے موجد گوٹن برگ (فوت ۱۴۶۸ء) سے پانچ سو برس پہلے عہد سلجوقی میں عربی کتابیں چھپنے لگی تھیں؟ ایسا ایک قرآن مجید اب ویانا (آسٹریا) کے کتب خانۂ عام میں محفوظ ہے، اس کے ایک صفحے کا فوٹو بھی دیا گیا ہے، (صفحہ ۲۰)

انگلستان میں منصور و ہارون رشید اور شارلمان کا معاصر بادشاہ اوفا (OFFA) گزرا ہے، اس کا ایک طلائی دینار برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، اس کے ایک طرف لاطینی میں OFFA REX (اوفا بادشاہ) کندہ ہے تو دوسری طرف عربی خط میں "لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" (صفحہ ۸۵) کندہ ہے، حمید اللہ صاحب نے یہ قیاس و امکان ظاہر کیا ہے، کہ غالباً اس بادشاہ کا نام اوفیٰ تھا، جو ایک معروف عربی نام ہے، اور جس کے معنے ہوتے ہیں سب سے زیادہ وفادار، اور شاید وہ مسلمان ہو چکا ہو، اور اپنے رقیب شارلمان ہی کی طرح اس نے بھی ہارون رشید سے خط و کتابت کی ہو، اور سفیر جب واپسی پر عباسی سکے ساتھ لایا تو انگریزی دار الضرب نے ان ہی نقل کی ہو (صفحہ ۸۵)، کہ یہ سکہ جس کا فوٹو دیا گیا ہے، خلیفہ منصور کے دینار کی ہو بہو نقل ہے،

مقدمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین اسلامی کتبے ۵ھ کے غزوۂ خندق کے زمانے کے مدینہ منورہ میں دستیاب ہوئے ہیں، ان کے فوٹو بھی ہیں، ان میں سے ایک پر (صفحہ ۶۵) اور سپاہی صحابہ کے ناموں کے ساتھ "انا محمد بن عبد اللہ" کا ولولہ انگیز نام بھی صاف پڑھا جاتا ہے، ایک اور میں ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی ہیں۔

ایک اور فوٹو ۲۲ھ (ص ۴۴) یعنی حضرت عمرؓ کے زمانے کا ایک فوجی مراسلہ ہے جس کے بعض حروف پر نقطے بھی ہیں۔

ایک اور قابل ذکر فوٹو حضرت عثمانؓ کے اپنے قرآن مجید کا ہے جس کے آخر میں لکھا ہے: (ص ۱۲۸) "کتبہ عثمان بن عفان"۔ حضرت عثمانؓ کے مختلف صوبوں کو بھیجے ہوئے دو اور قرآن محفوظ ہیں، ان میں سب سے عجیب چیز یہ نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں حرف یا ایک شوشے سے نہیں بلکہ دو شوشوں سے لکھتے تھے، زائد کو اسس، آیۃ کو اییۃ تحریر کیا جاتا تھا، ایسی درجن بھر آیتوں کے فوٹو دیے گئے ہیں، (صفحہ ۱۲ و مابعد) یہ بحث اس سلسلے میں ہوئی ہے کہ مکتوب نبویؐ بنام المنذر بن ساوی میں "الٰہ غیرہ" لکھا ہوا ملتا ہے، "لا الٰہ غیرہ" نہیں، فرنگیوں کے لئے یہ کافی تھا، کہ اس مکتوب کو جعلی قرار دیں، حمید اللہ صاحب بتلاتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں یہی طریقہ کتابت زیادہ تر رائج تھا۔

ایک پر لطف چیز یہ ہے کہ سنہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ سے واپسی پر، جس پر اس سال پورے چودہ سو سال گزر رہے ہیں، رسول اکرمؐ نے تبلیغ دین کے لیے یک وقت تین براعظموں میں سرگرم کوشش فرمائی، مرسل الیہم میں سے ایک قیصر روم یورپ میں تھا، کسرائے ایران ایشیا میں اور نجاشی حبشہ اور مقوقس مصر افریقہ میں، یہ اور متعدد دیگر تبلیغی خط ایک ہی دن خصوصی سفیروں کے ذریعے سے روانہ کئے گئے، نبی امی "علم بالقلم" کی تعلیم بھی دیتے ہیں، تعمیل بھی کرتے ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔

صفحہ ۴۴ پر ایک طباعتی غلطی بھی ہے، کتبہ نہیں کتنبہ ہونا چاہیے، جیسا کہ اصل کے فوٹو میں صاف نظر آتا ہے۔

کتاب میں اشاریہ (انڈکس) بھی ہے۔

(معارف)

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۃ الاخلاص از تالیف شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہؒ، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۸۶ مع خوبصورت ٹائٹل، قیمت تحریر نہیں، الدار السلفیہ ۲/۸ اے۔ حضرت پریس، شیخ حفیظ الدین روڈ، بائیکلہ برج، بمبئی ۸ ..... ہند۔

الدار السلفیہ بمبئی نے مولانا مختار احمد ندوی نائب صدر جمعیۃ اہلحدیث ہند کی سربراہی میں بڑی ترقی کی ہے، اور اس نے تھوڑی ہی مدت میں اردو کی مفید اصلاحی و دینی کتابوں کے علاوہ عربی کی بھی متعدد بلند پایہ اور نادر کتابیں اہتمام سے شائع کی ہیں، اب ادارہ کو طباعت و اشاعت کے جدید وسائل و آلات بھی میسر آگئے ہیں، اس لئے اس نے اپنے دوسرے اشاعتی پروگرام موخر کرکے جدید مطبع کا آغاز زیر نظر کتاب سے اس بنا پر کیا ہے کہ یہ قرآنی موضوع اور اسلام کے اساسی و اولین عقیدہ توحید کے متعلق ایک بے نظیر تصنیف ہے، اس کے مصنف شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ان نادرۂ روزگار علمائے اسلام میں ہیں، جن کی تمام کتابیں اور تحریریں دینی و ایمانی حرارت اور اسلام کے صحیح فکر و عقیدہ کی ترجمان اور ان کی مجتہدانہ فکر و نظر، علمی تبحر، جودت طبع اور ذہن رسا کا حیرت انگیز نمونہ ہوتی ہیں، سورۂ اخلاص کی یہ تفسیر بھی امام ہمام کی نہایت اہم تصنیف ہے، جو ان کی وسعت علم و نظر، کتاب و سنت سے گہری واقفیت اور عقیدہ و مسلک کی استواری و پختگی کا ثبوت اور نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی سے معمور ہے، یہ کتاب دراصل ایک استفسار کے جواب میں قلمبند کی گئی تھی، جو سورۂ اخلاص کے متعلق کی اور اس کے ثلث قرآن کا مطلب دریافت کرنے

کے لیے ان سے کیا گیا تھا، امام ابن تیمیہ نے مجرد سوال کے جواب پر اکتفا نہ کرتے ہوئے پوری سورہ کی مکمل تفسیر لکھی، اور اس کے ضمن میں گوناگوں علمی، دینی اور قرآنی حقائق و دقائق بیان فرمائے، لفظ صمد کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں مختلف روایات و آثار اور سلف کے اقوال بھی جمع کر دئے ہیں، سورہ کے مضمون توحید پر مختلف پہلوؤں سے مفصل بحث کی ہے، اور اس ضمن میں خدا کی صفات کے مسئلہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کے علاوہ مشرکین و نصاریٰ اور خود مسلمانوں کے باطل فرقوں کے گمراہ کن خیالات کی تردید بھی کی ہے، اور مشاہد و مساجد کی زیارت و تقدس کے مسئلہ میں بھی بے اعتدالیوں کا ذکر کیا ہے، یہ تفسیر اصلاً امام صاحب کے مجموعۂ فتاوی میں شامل تھی، جو کئی بار علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے، مگر اب بہت کمیاب تھی، اس لئے الدار السلفیہ نے اسے اپنے نئے مطبع سے موجودہ اعلیٰ طباعتی معیار کے مطابق شائع کیا ہے، ادارہ کے علمی و تحقیقی شعبہ کے صدر ڈاکٹر عبد العلی نے مختلف نسخوں کی مدد سے اس کے متن کی تصحیح کر کے جا بجا حاشی لکھے ہیں، جن میں آیتوں اور حدیثوں کی تخریج، روایتوں کی قوت و ضعف کی وضاحت اور بعض راویوں کے مختصر حالات تحریر کئے ہیں، شروع میں ان کے قلم سے ایک مفید مقدمہ بھی ہے، اس میں امام ابن تیمیہ کے حالات اور تفسیر سورۂ اخلاص کی اہمیت و خصوصیت کے علاوہ زیر نظر نسخہ کے بارہ میں بعض وضاحتیں درج ہیں،

اسلامیات:- مرتبہ جناب مالک رام صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ صفحات ۱۸۴ - مجلد، قیمت ۲۰ روپے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو کے مشہور اہل قلم اور غالبیات کے ماہر جناب مالک رام صاحب وقتاً فوقتاً اسلام اور اسلامی مسائل کے بارہ میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں، اب مکتبہ جامعہ نے اسلامی موضوعات پر ان کے حسبِ ذیل چھ مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے، (۱) لا الٰہ الا اللہ۔

(۲) الاسلام (۳) اسلامی خلافت (۴) خلق عظیم (۵) افصح العرب (۶) عورت مذاہب عالم میں، پہلے مضمون میں اس پر زور دیا گیا ہے، کہ اسلام ہی اصل میں خدا کا دین ہے، اسی کی دعوت دینے کے لیے ہر قوم میں نبی بھیجے گئے، مگر بد قسمتی سے ان قوموں نے اپنے انبیاء کو معبود کا درجہ دے دیا، اسلام کے کلمۂ طیبہ میں اسی گمراہی کا سدّ باب کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں کلمہ میں رسول کے نام کی شمولیت کو شرک اور عقیدۂ توحید کے منافی بتانے والوں کی تردید کی گئی ہے، دوسرے مضمون میں بتایا ہے کہ دین کے بنیادی تصورات و معتقدات ہمیشہ ایک رہے، تغیر و ارتقا کا عمل شریعت و قانون میں ہوا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہو گیا، گذشتہ تمام امتوں کا دین اسلام تھا، اور اس کے ماننے والے مسلم تھے، ان کے خیال میں ہر قوم اہل کتاب تھی کیونکہ ہر ایک کی اصلاح کے لیے نبی آئے، چاہے اس کے نبی کو کتاب دی گئی ہو یا وہ اپنے پیشرو نبی کی کتاب و شریعت ہی کی دعوت دینے کے لئے آیا ہو، اور جس طرح ہزاروں رسول کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا، اسی طرح ان اہل کتاب قوموں اور ان کی کتابوں کے نام بھی مذکور نہیں، اسی سلسلہ میں سورۂ فاتحہ کی روشنی میں دین کے بنیادی اصول و کلیات بیان کر کے بتایا ہے کہ اس میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو دین ہے، اور بقیہ قرآن سورۂ فاتحہ کی تفسیر و تعبیر ہے، تیسرے مضمون میں خلافت کا مفہوم، چاروں خلفا کے طریقۂ انتخاب، شوریٰ کی اہمیت، خلیفہ کے صفات و فرائض اور خلیفہ کے اصول کی وضاحت کی ہے، اس مضمون کی اہم اور خاص باتیں دو ہیں، ایک یہ کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا کوئی اصول نہیں ہے، اسی لئے چاروں خلفا کا انتخاب جدا جدا طریقے سے ہوا، اور دوسری یہ کہ اسلام میں معاملات حکومت میں اصحاب رائے اور اہل علم و فکر سے مشورہ کرنے کے حکم کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا ہے کہ کسی معاملہ میں حتمی فیصلہ پر پہنچ جانے کے بعد مشورہ دینے والوں کی رائے کے خلاف عزم و ارادہ کریں تو توکل علی اللہ اس پر کاربند ہو جائیں، مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور خلفائے راشدین رض کے دور سے اکثریت کے فیصلہ کے خلاف عمل کرنے کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں، چوتھے مضمون میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کو نہایت موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے، پہلے آپ کے مخالفین کی تین قسمیں بتائی ہیں، مشرکین، یہود اور منافقین، اور ہر ایک کی مخالفت، ایذا رسانی اور عناد کے مختلف واقعات و اسباب بیان کر کے دکھایا ہے کہ آپ کس طرح ضبط و تحمل کا پہاڑ بنے رہے، اور جب دشمن آپ کی مٹھی میں آگئے تو آپ نے ان کے ساتھ عفو و درگذر اور حسن سلوک کا برتاؤ کیا۔ جو آپ کے خلق عظیم اور لطف عمیم کا بڑا ثبوت ہے، پانچواں مضمون افصح العرب ہے، اس میں ہر نبی کے ابتدا میں اکیلا اور تنہا ہونے اور ہر طرف سے اس کی مخالفت کئے جانے اور آخر میں اس کی کامیابی اور اس کے دشمنوں کی ناکامی کا ذکر ہے، اس کا سبب جہاں نبی کے پیام کی صداقت ہے، وہاں اس کو پیش کرنے کا انداز بھی ہے، اس مضمون میں اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تبلیغی خطوط کا ذکر ہے، جو آپ نے بعض سلاطین اور قبائل کے رئیسوں کو لکھے تھے، اور ان کی فصاحت، بلاغت، سلاست، ایجاز اور اقتضائے حال سے مطابقت دکھائی ہے، پھر آپ کے چند خطبوں پر بحث کر کے ان میں طریقۂ ادا کا حسن اور اظہار و ابلاغ کا موثر انداز دکھایا ہے، آخر میں آپ کی چند حدیثیں درج کی ہیں، جو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکی ہیں، آخری مضمون میں اسلام کے خدا کا آخری اور مکمل ترین پیام ہونے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے عورتوں کے بارہ میں اس کی جامع تعلیم و ہدایت پیش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں عورت کے درجہ و مرتبہ، تعلیم نسواں، نکاح، اس کی رسموں، اس کی غرض، اس کی بعض شرطوں اور طریقوں، مہر، تعدد ازدواج، اہلی زندگی، بیوی کے حقوق و فرائض، زنا سے بچنے کے طریقے، زنا کی تہمت، لعان، طلاق، خلع، نکاح بیوگان اور وراثت کے بارہ میں اسلام کے احکام کی خوبی و برتری کو نمایاں کرنے کیلئے

ہندو، یہودی، عیسائی اور بعض دوسرے مذاہب کی بھی اس سلسلہ کی تعلیم بیان کی ہے، یہ سب مضامین غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں، زبان و بیان کی خوبی کے لیے مصنف کا نام ہی پوری ضمانت ہے، مگر اول الذکر دو مضامین میں ان کے بعض قیاسات و نتائج درست نہیں معلوم ہوتے یا کہیں کہیں ان کی تعبیر گنجلک معلوم ہوتی ہے، مثلاً ان کی تعبیر سے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید وحدت ادیان کا قائل ہے اور اس کی رو سے ہر دین اسلام ہے اور وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، جب کہ قرآن مجید میں صرف وحدت دین کا ذکر ہے اور اس نے یہ بتایا ہے کہ خدا کے نزدیک اصل دین اسلام ہے جس کو اس نے اتارا ہے، اور اسی کی تعلیم تمام انبیاءؑ لے دی تھی جن لوگوں نے اسکو قبول کیا وہ مسلم تھے، مگر جن لوگوں نے اسے چھوڑ کر اپنا الگ راستہ تجویز کیا، اور کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے اور اسی کو اپنا دین سمجھنے لگے، وہ نہ مسلم تھے، اور نہ ان کا مذہب اسلام تھا، اگر ہر قوم کا خود ساختہ دین اسلام ہوتا تو انبیائے کرامؑ اس کا ابطال کیوں کرتے، اور کیوں قرآن یہودیت و نصرانیت کی مذمت کر کے ان کے ماننے والوں کو حضرت ابراہیمؑ کی ملت حنیف کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا، بنیادی تصورات و معتقدات کی وحدت سے بھی صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حد تک ہر نبی کی دعوت یکساں رہی ہے، یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ جن قوموں کی اصلاح کے لیے نبی آئے تھے، وہ ان کو مانتی تھیں، اگر مانتیں تو انبیاءؑ اپنی دعوت کے آغاز میں ان بنیادی باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتے، انبیاء کے اس طریقۂ دعوت سے صاف ظاہر ہے کہ ہر نبی کی قوم اصل دین اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کو اختیار کئے ہوئے تھی، اور وہ انہی بنیادی تصورات کی دعوت دینے کی وجہ سے انبیاءؑ کی شدید مخالفت کرتی تھی، اس بنا پر یہ کہنا کہ گزشتہ تمام امتوں کا دین اسلام تھا، اور وہ مسلم تھیں، اور وہ تمام مذاہب جو وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے نازل ہوئے اسلام تھے، یا خدا کی طرف سے نازل ہونے والا ہر دین اسلام تھا، صحیح تعبیر نہیں ہے، صحیح تعبیر یہ ہے کہ گذشتہ تمام پیغمبروں کا دین اسلام تھا اور تمام ادیان و مذاہب نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ایک ہی دین نازل ہوا تھا، جو اسلام ہے،

دراصل ہر مذہب میں بعض ایسی مشترک اصولی اور بنیادی باتیں ملتی ہیں، جن کی وجہ سے وحدتِ ادیان کا تصور پیدا ہوتا ہے، لیکن ہر مذہب کی شریعت اور منہاج کے مختلف ہونے کی وجہ سے وحدت ادیان کا یہ تصور ختم ہو جاتا ہے جس سے غالباً ہمارے فاضل مصنف کو بھی اتفاق ہے، مصنف اسلام کے بنیادی تصورات میں توحید آخرت اور یتامیٰ و مساکین کی امداد کا ذکر کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں، کہ بنیادی چیز خدا کی ہستی پر ایمان کامل اور اسکی عبادت ہے، لیکن یہ محض کلمہ کا ایک جز لا الٰہ الا اللہ ہے، مگر وہ اسکے دوسرے جز محمد رسول اللہ اور اسلام کے تصور رسالت کا ذکر نہیں کرتے جب کہ انھیں یہ تسلیم ہے کہ محمدؐ آخری اور مکمل دین لائے، گذشتہ جن قوموں نے انبیاءؑ کی تکذیب کی یا موجودہ دور کی جن قوموں کے بارہ میں قرآن مجید کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، انھیں قطعیت کے ساتھ اہل کتاب قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

مطالعات :- جلد اوّل، مرتبہ ڈاکٹر بدرالدین بٹ تقطیع متوسط، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۸۸ قیمت ۳۰ روپیے پتہ (۱) ڈاکٹر بدرالدین بٹ کوئل، پلوامہ کشمیر (۲) مکتبہ علم و ادب بیڈ کراس روڈ سری نگر۔

یہ کتاب چھ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں عربی میں لفظ ادب کے تصور و مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور اس میں عہد بعہد کے تغیر کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اب ادب کا کیا مطلب سمجھا جاتا ہے، دوسرے میں اصلاً اندلس کی عربی شاعری میں منظر نگاری کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اور ضمناً عام عربی شاعری میں منظر نگاری کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے، آخر کے چار مضامین میں عربی زبان کے چار مشہور ادیبوں اور انشاپردازوں ابوحیان توحیدی، بدیع الزماں ہمدانی، صاحب ابن عباد اور قاضی محسن تنوخی کے حالات و کمالات بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے ان چاروں مصنفین کی کتابوں کا تعارف کرا کے ان کے طرز نگارش اور اسلوب کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں اور ان کے ادبی درجہ و مرتبہ پر بھی بحث کی ہے، انھوں نے اردو میں عربی زبان و ادب اور اس کے مشہور ادیبوں پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اس کی پہلی کڑی ہے، امید ہے، عربی زبان و ادب کے طلبہ و شائقین میں یہ سلسلہ مقبول ہوگا، لیکن ابھی یہ مرتب کی پہلی پیش کش ہے، اس لیے زبان و بیان کی فروگذاشتوں کے علاوہ دوسری حیثیتوں سے بھی اس میں کور کسر ہے، جو آئندہ مشق و ممارست کے بعد دور ہو جائے گی۔

"ض"

جلد ۱۳۸ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء عدد ۶

مضامین

مقالات